ستمبر 2014، قیمت 10 ₹

ماہنامہ

بچوں کی دنیا

دہلی

Monthly BACHON KI DUNIYA, New Delhi

یوم اساتذہ مبارک

BACHON KI DUNIYA Monthly, September 2014, Vol. 02, Issue: 09
National Council for Promotion of Urdu Language
Department of Higher Education, Ministry of Human Resource Development, Government of India

RNI NO. DELURD/2013/50375
DL (S) - 01/3439-2013-15
Date of Publication : 11/08/14
Date of Dispatch : 12 and 13 of Advance Month

بچوں کے لیے قومی اردو کونسل کی چند دل چسپ کتابیں

اقبال کی کہانی
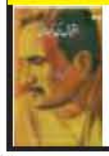
مصنف: جگن ناتھ آزاد
صفحات: 63
قیمت: -/10 روپے

بے زبان ساتھی

مصنف: وکیل نجیب
صفحات: 64
قیمت: -/13 روپے

ایک نائی اور رنگساز کا قصہ

مصنف: اطہر پرویز
صفحات: 148
قیمت: -/20 روپے

دلچسپ کہانیاں
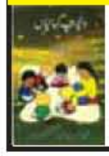
مصنف: رام آسرا راز
صفحات: 188
قیمت: -/22 روپے

چار درویشوں کا قصہ

مرتب: نورالحسن نقوی
صفحات: 95
قیمت: -/16 روپے

ہمارے جاں باز

مصنف: پریم پال اشک
صفحات: 166
قیمت: -/24 روپے

بچوں کے حالی

مرتب: صالحہ عابد حسین
صفحات: 63
قیمت: -/14 روپے

نہرو کے اَن دیکھے روپ

مصنف: پی ڈی ٹنڈن
مترجم: نورالحسن نقوی
صفحات: 219
قیمت: -/23 روپے

رابنسن کروسو

مصنف: ڈینیل ڈیفو، تلخیص: م ندیم
صفحات: 82
قیمت: -/13 روپے

نور جہاں

مصنف: ایم آر کوہلی
صفحات: 45
قیمت: -/14 روپے

ہمالیہ کے بنجارے

مصنف: شیام سنگھ ششی
مترجم: کمال احمد صدیقی
صفحات: 96
قیمت: -/16 روپے

قصہ شیر کا شکاری کی زبانی

مصنف: اسرار احمد خاں دُرّانی
صفحات: 212
قیمت: -/51 روپے

گاندھی اَہنسا کا سپاہی

مصنف: پی ڈی ٹنڈن سرویندر کی واڑلے
مترجم محمد حسن قدوائی
صفحات: 144
قیمت: -/21 روپے

مشینی گھوڑا

مصنف: اطہر پرویز
صفحات: 143
قیمت: -/12 روپے

پوربی دیسوں کی کہانیاں

مصنف: کلا تھیرانی
مترجم: عائشہ صدیقی
صفحات: 341
قیمت: -/39 روپے

بچوں کا باغ

مصنف: ظفر کمالی
صفحات: 64
قیمت: -/24 روپے

گیت گاتے رہو

مصنف: شبنم کمالی
صفحات: 65
قیمت: -/14 روپے

بوستاں کی کہانیاں
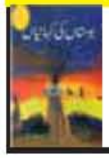
مرتب: علقمہ شبلی
صفحات: 87
قیمت: -/15 روپے

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، ونگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066
فون: 011-26109746، فیکس: 011-26108159، E-mail.:ncpulsaleunit@gmail.com, sales@ncpul.in

Printed and Published by Dr. Khwaja Md. Ekramuddin, Director, NCPUL on behalf of NCPUL, FAROGH-E-URDU-BHAWAN, FC-33/9, Institutional Area, Jasola, New Delhi-110025, and printed at S. Narayan & Sons, B-88, Okhla Indl. Area Phase-II, New Delhi-110020 on 80 GSM Art Paper produced by JK Editor : Dr. Khwaja Md. Ekramuddin, Tel : 49539000

اس شمارے میں

مدیر کا خط	آپس کی باتیں	مدیر	2
نظم	میٹرو ریل	رفیق گلاب	3
یوم اساتذہ	آخری سبق (فرنچ کہانی)	الفانسو دودے	4
		ترجمہ: عبدالرحمٰن انصاری	
دل چسپ خبریں	دنیا ایک عجائب خانہ	ادارہ	10
مشاعرہ	باسی عید کا مشاعرہ	رفیع انصاری	14
نظمیں	میرے اللہ	ایم نصراللہ	18
	گڑیا کی شادی، میری بلی	اسلم آزاد	19
کہانی	پہاڑ اور ندی	حبیب رحمٰن پوری	20
تاریخی کہانی	ایک ہی صف میں...	محمد اطہر مسعود خاں	24
لوک کہانی	سچ کا جھوٹ، جھوٹ کا سچ	محمد عالم گوہر	28
جاسوسی کہانی	کاغذ کا شلشہ	محمد امان اللہ	34
نظم	ققنس	مجیب شہزر	37

عجیب عمارت	گول گھر	ظفر سعیدی	38
نظم	قدرت کے کھیل نرالے	زہیب قادری	42
کامکس	بھولے بھالو کی حماقتیں	ادارہ	43
نانی کا صندوق	میں تو چلی کاشی	شیلیندر	50

قسط وار	فسانۂ عجائب 6	رجب علی بیگ سرور	51
ننھے منکر	بچوں کی نگارشات	ادارہ	60
اردو ایس ایم ایس	یہ مزے مزے کی حکایتیں	ادارہ	61
انٹرنیٹ سے	انوکھے منظر	ادارہ	64

ماہنامہ بچوں کی دنیا دہلی

جلد:2 شمارہ:9 ستمبر 2014

مدیر اعلیٰ: ڈاکٹر خواجہ محمد اکرام الدین

نائب مدیر: ڈاکٹر عبدالحی

اعزازی مدیر: نصرت ظہیر

ناشر اور طابع:

ڈائرکٹر، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان

وزارت ترقی انسانی وسائل، محکمہ اعلیٰ تعلیم، حکومت ہند

مطبع: ایس نارائن اینڈ سنز، بی۔88، اوکھلا انڈسٹریل ایریا

فیز-II، نئی دہلی-110020

مقام اشاعت: دفتر قومی اردو کونسل

قیمت-/10 روپے سالانہ -/100 روپے

■ اس شمارے کے قلم کاروں کی آراسے قومی اردو کونسل NCPUL اور اس کے مدیر کا متفق ہونا ضروری نہیں

صدر دفتر

فروغ اردو بھون، ایف سی 33/9، انسٹی ٹیوشنل ایریا

جسولہ، نئی دہلی-110025

فون: 49539000

شعبۂ ادارت: 49539008-11

ای میل

bachonkiduniya @ncpul.in

editor@ncpul.in

ویب سائٹ

http://www.urducouncil.nic.in

شعبۂ فروخت: فون: 26109746

ویسٹ بلاک-8، ونگ-7 آر کے پورم،

نئی دہلی-110066

ای میل: sales@ncpul.in

ncpulsaleunit@gmail.com

'بچوں کی دنیا' کی خریداری کے لیے چیک، ڈرافٹ یا منی آرڈر بنام NCPUL، شعبۂ فروخت کے پتے پر بھیجیں اور وضاحت طلب امور کے لیے وہیں رابطہ فرمائیں

شاخ 110-7-22، تھرڈ فلور، ساجد یار جنگ کمپلکس

بلاک نمبر 6-1، چھتہ بازار، حیدرآباد-500002

فون: 24415194 - 040

آپس کی باتیں

عزیز دوستو، صوفی سنت شاعروں میں، کبیر کا نام بڑا اونچا ہے۔ اپنی سیدھی سادی بولی میں انھوں نے بڑی کام کی باتیں کہی ہیں۔ ان کی پوری شاعری اور دوہے ایسی باتوں سے بھرے پڑے ہیں۔ ان کی باتیں زندگی کی الجھنوں کو دور اور دماغ کو روشن کرتی ہیں۔ آج سیکڑوں سال بعد بھی کبیر کی شاعری ہر موڑ پر ہمیں راہ دکھاتی ہے۔ آپ جانتے ہی ہوں گے کہ کبیر کی پرورش بہت ہی غریب گھر میں ہوئی تھی اور بڑی مشکل سے کپڑا بُن کر وہ گھر چلاتے تھے۔ یہ بھی کہتے ہیں کہ وہ پڑھے لکھے نہیں تھے۔ لیکن آج شائد ہی کوئی ایسا طالب علم ہوگا جس نے انھیں نہ پڑھا ہو۔ ہزاروں اسکولوں میں ان کا کلام پڑھایا جاتا ہے، اساتذہ اس کلام کی تشریح کرتے ہیں اور کالجوں اور یونیورسٹیوں میں ان کے نظریات پر ریسرچ ہوتی ہے۔ کبیر نے بڑی بڑی کتابیں چاہے نہ پڑھی ہوں لیکن زندگی کی کتاب کو انھوں نے اتنے غور اور اتنے دھیان سے پڑھا تھا کہ بڑے بڑے عالم بھی مسئلوں کو اتنی آسانی سے نہیں سمجھ پاتے جتنی آسانی سے وہ سمجھ لیتے تھے۔ کبیر کو کبھی کسی مدرسے یا پاٹھ شالہ میں جانا نصیب نہیں ہوا لیکن استاد کی اہمیت کو وہ اچھی طرح جانتے تھے۔ استاد کا درجہ کتنا بڑا ہے یہ انھوں نے اپنے ایک دوہے میں اپنے زمانے کی عام بولی میں، بڑی خوب صورتی اور بڑی محبت وعقیدت سے بیان کیا ہے۔ کہتے ہیں:

گرو، گووند دونوں کھڑے کا کے لاگوں پائے
بلہاری گروآپ کے گووند دیو بتائے

یعنی استاد اور گووند (بمعنی خدا) دونوں میرے سامنے ہیں اور میں طے نہیں کر پا رہا ہوں کہ کس کے پاؤں پہلے چھوؤں۔ تب خود ہی فیصلہ کرتے ہیں کہ قربان جاتا ہوں اپنے استاد کے جنھوں نے مجھے یہ سمجھایا کہ خدا کیا ہے۔ اس لیے پہلے مجھے استاد کے ہی قدم چھونے چاہئیں۔ یہ ہے علم اور علم کو سکھانے والے کی اہمیت۔

پیارے دوستو، آپ یہ بھی جانتے ہیں کہ ہر سال ستمبر کی پانچ تاریخ کو ہمارے یہاں، ملک بھر میں یوم اساتذہ منایا جاتا ہے۔ اس روز اسکولوں میں بچّے اپنے اساتذہ کو مبارک باد کے کارڈ اور تحائف دے کر ان کی دعائیں لیتے ہیں۔ کہیں کہیں بچّوں کی تقریروں کے مقابلے ہوتے ہیں جن میں استاد کی عظمت بیان کی جاتی ہے اور اساتذہ بھی بچوں کو اپنے خیالات اور تجربات سے آگاہ کراتے ہیں۔ مگر یہ صرف رسمیں ادا کرنے کا دن نہیں۔ اس دن ہم یہ عہد بھی کرتے ہیں کہ اپنے استادوں اور استانیوں کی باتوں کو توجہ سے سنیں گے اور ان کی سکھائی ہوئی اچھی اچھی باتوں پر دل وجان سے عمل کریں گے۔ دوسری طرف ہمارے اساتذہ کے لیے بھی یہ ایک خاص موقع ہوتا ہے کہ وہ اپنی سال بھر کی کارکردگی کا جائزہ لیں اور دیکھیں کہ جو کچھ وہ اپنے شاگردوں کو علم کی صورت میں دے رہے ہیں وہ ان تک ٹھیک طرح پہنچ رہا ہے یا نہیں۔ بچّے اسے پوری طرح اپنے دل ودماغ میں اتار رہے ہیں یا اس میں انھیں کوئی دقّت پیش آرہی ہے۔ خود اپنے کام پر وہ اس لیے نظر ڈالتے ہیں کیونکہ انھیں اپنے کام کی اہمیت کا پورا احساس ہے۔ وہ جانتے ہیں کہ ان پر جو ذمہ داری ہے وہ ہمارے والدین کی ذمہ داریوں سے کہیں زیادہ بڑی ہے۔ انھیں دو چار بچوں کی نہیں بلکہ پوری نسل کی پرورش کرنی ہوتی ہے۔ اس لیے ننھے دوستو، جتنا خیال اساتذہ ہمارا رکھتے ہیں، ہمارا فرض بنتا ہے اس سے زیادہ ہم اُن کا خیال رکھیں اور جو کچھ وہ سکھاتے اور پڑھاتے ہیں اس پر پوری توجہ دیں کیونکہ استاد کے لیے سب سے بڑا تحفہ اور انعام یہی ہوتا ہے کہ شاگرد اُس کے دیے ہوئے علم کو پوری لگن سے سیکھ لے! آپ کا

(پروفیسر خواجہ محمد اکرام الدین)

رفیق گلاب

میٹرو ریل

پہلے یہ دہلی میں آئی
پھر ممبئی کی شان بڑھائی
رب کا شکر ادا کر بھائی
میٹرو نعمت بن کر آئی

جلدی منزل پر پہنچائے
مسافروں کا وقت بچائے
ہر شہری نے راحت پائی
میٹرو نعمت بن کر آئی

ڈبوں میں ایئر کنڈیشن
دلکش ہیں سارے اسٹیشن
خوشیوں کی باجے شہنائی
میٹرو نعمت بن کر آئی

مل جل کر سب آئیں جائیں
یک جہتی کا فرض نبھائیں
ہندو مسلم سکھ عیسائی
میٹرو نعمت بن کر آئی

Mr Rafiq Gulab3-C,102, Srvodaya Park Kalyan West Thane-421301 Maharashtra

الفانسو دودے   ترجمہ: عبدالرحمان انصاری

یوم اساتذہ پر خاص پیشکش

آخری سبق!

اس صبح مجھے اسکول جانے میں کافی تاخیر ہو رہی تھی۔ مجھے خوف تھا کہ کافی ڈانٹ کھانی پڑے گی۔ خاص طور سے ماسٹر آمیل سے جنھوں نے کہا تھا کہ وہ ہم سے صیغۂ ماضی کے بارے میں سوالات کریں گے۔ میں گرامر کے اس حصّے کے پہلے لفظ سے بھی آشنا نہیں تھا۔ ایک لمحے کے لیے میرے دل میں خیال آیا کیوں نہ آج کلاس چھوڑ کر کھیتوں میں سیر سپاٹا کر لیا جائے۔

باہر ہلکی سردی کے ساتھ فضا کافی خوشگوار تھی۔ جنگل کے دہانے پر طوطا، مینا کی چہچہاہٹ اور آرا مشین کے پیچھے والے ریپر گھاس کے میدان سے جرمن فوجیوں کی پریڈ کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ یہ سب مجھے صیغۂ ماضی کے اصولوں سے زیادہ دل فریب معلوم ہو رہا تھا۔ پھر بھی میں نے کسی طرح اپنے آپ پر قابو پالیا اور اسکول کی طرف تیزی سے دوڑتا ہوا بھاگا۔

ٹاؤن ہال کے پاس سے گزرتے ہوئے میں نے چھوٹے سے نوٹس بورڈ کے پاس کچھ لوگوں کا مجمع دیکھا۔ پچھلے دو سال سے ساری بری خبریں ہمیں یہیں سے ملتی تھیں۔ چاہے وہ ہاری ہوئی جنگیں ہوں، کمانڈر کے احکامات یا پھر کسی طرح کی بھی حکم وصولی ہو۔ میں تیز

یہ ساری باتیں مجھے ششدر کیے جارہی تھیں کہ تبھی ماسٹر آمیل اپنی کرسی کی طرف بڑھے۔ ان کی شفیق اور بھاری بھرکم آواز میں، جس سے انھوں نے ابھی ابھی مجھے مخاطب کیا تھا، کہنا شروع کیا:

''عزیز بچوں! آج میری آپ کے ساتھ آخری کلاس ہوگی! برلن سے حکم نامہ آیا ہے کہ آلزاس اور لورین کے سبھی اسکولوں میں اب سے صرف جرمن زبان ہی پڑھائی جائے گی۔ کل سے آپ کے نئے ماسٹر آئیں گے۔ لہٰذا، آج آپ لوگوں کا فرانسیسی زبان کا آخری سبق ہوگا۔ اس لیے میری گزارش ہے کہ اسے غور سے سن لیں!''

ان چند الفاظوں نے مجھے جھنجھوڑ کر رکھ دیا تھا۔ آہ، تو ان کم بختوں نے ٹاؤن ہال کے نوٹس بورڈ پر یہی پیغام بھجوایا تھا۔

کیا سچ مچ میرا فرانسیسی کا آج آخری سبق ہوگا؟

مجھے تو ابھی ٹھیک سے لکھنا بھی نہیں آتا ہے۔ یا خدا، اب تو میں کبھی سیکھ ہی نہیں پاؤں گا۔ نہیں ایسا ہرگز نہیں ہوگا۔ اب مجھے فضول میں گنوائے وقت کے لیے پشیمانی ہونے لگی۔ میں سوچنے لگا ان لمحوں کے بارے میں جب میں کلاس چھوڑ کر چڑیوں کے گھونسلے ڈھونڈھتا پھرتا اور سار کے میدان میں اسکیٹنگ کرتا رہتا تھا۔ میری قواعد، تاریخ اور دینیات کی کتابیں جو تھوڑی دیر پہلے مجھے حد درجہ بیزار کن لگتی تھیں اور جن کا اٹھانا میرے لیے دوبھر ہوا کرتا تھا، مجھے ان پرانے دوستوں جیسی محسوس ہونے لگیں جن سے بچھڑنے کے وقت آنکھیں ڈبڈبا آتی ہیں۔ ٹھیک یہی معاملہ ماسٹر آمیل کے ساتھ بھی تھا۔ ایسا سوچ کر کہ وہ ہمیں چھوڑ کر جانے والے ہیں اور پھر میں دوبارہ انھیں کبھی دیکھ نہیں پاؤں گا، میں ان کی سزائیں اور ڈنڈے کی چوٹ سب بھول گیا۔ بے

تھے اور ان کے سر پر کالی کڑھائی کی ہوئی ریشمی ٹوپی تھی جسے وہ صرف امتحان کے روز یا تقسیم انعامات کی تقریب کے موقع پر ہی پہنتے تھے۔ پوری کلاس میں ایک عجیب خوشگواری اور سنجیدگی کا سماں تھا۔ لیکن مجھے جس بات پر سب سے زیادہ حیرانی ہوئی وہ یہ کہ کلاس کے پیچھے والی کرسیاں جو عام طور سے خالی پڑی رہتی تھیں ان پر گاؤں کے بزرگ حضرات ہماری طرح ہی دم سادھے چپ چاپ بیٹھے ہوئے تھے۔ سہ گوشہ ٹوپی پہنے بوڑھے اوزے، سابق میئر، پرانا ڈاکیہ اور بھی گاؤں کے چند لوگ موجود تھے۔ ہر ایک کے چہرے سے اداسی جھلک رہی تھی۔ بوڑھے اوزے اپنے ساتھ حروف تہجی Alphabates کی ایک پرانی کتاب بھی لائے تھے جس کے کنارے گھسے ہوئے تھے۔ وہ پوری شان سے اسے کھول کر اپنے گھٹنوں پر ٹکائے ہوئے تھے اور ان کے صفحوں کے درمیان انھوں نے اپنی موٹے موٹے شیشوں والی عینک ترچھی کر کے رکھ لی تھی۔

انیسویں صدی میں روسی و جرمنی فوج اور فرانس کے درمیان جولڑائی ہوئی تھی اس کے پس منظر میں لکھی گئی یہ کہانی فرانسیسی زبان کے ہی نہیں بلکہ دنیا کے ادب میں بھی ایک شاہکار کا درجہ رکھتی ہے۔ اس کے مصنف الفانسو دودےAlphonse Daudet ہیں جو 13 مئی 1840 کوفرانس کے شہر نیمز Nîmes میں پیدا ہوئے اور 16 دسمبر 1897 کو جن کا پیرس میں انتقال ہوا۔ ان کی لکھی ہوئی کئی کہانیاں فرانس میں بچوں کے تعلیمی نصاب کا حصہ ہیں۔ انھیں فرانس کا چارلس ڈکنس مانا جاتا ہے۔ان کی کہانیوں کا پہلا مجموعہ Lettres de mon moulin 'میری پون چکیوں کے خط' کے نام سے 1869 میں چھپا اور بہت پسند کیا گیا۔اس میں شامل کہانیLa Dernière Classe یعنی 'آخری سبق' ایک ایسے استاد کی کہانی ہے جو اپنی مادری زبان سے مادر وطن کی ہی طرح پیار کرتا ہے۔ انصاری صاحب کا کہنا ہے کہ انھوں نے اس کہانی کا فرنچ زبان سے سیدھے اردو میں ترجمہ کیا ہے۔ یوم اساتذہ پر ہم اسے ایک خاص تحفے کی طرح اس امید میں پیش کر رہے ہیں شاید ہماری طرح آپ کو بھی فرانسیسی زبان کے سبق میں اپنی مادری زبان اردو کی تصویر نظر آنے لگے!**مدیر اعزازی**

چارے ماسٹر جی۔

اوہ، تو اسی آخری کلاس کے اعزاز میں آج وہ اپنے مخصوص لباس میں تھے، اور اب میں سمجھا کہ کیوں یہ گاؤں کے بزرگ ترین لوگ کلاس میں تشریف لائے تھے۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ اسکول میں پہلے نہ آنے پر پچھتا رہے ہوں۔ شاید یہ ماسٹر آمیل کی چالیس سال کی خدمت کا شکریہ ادا کرنا چاہتے تھے اور اپنے وطن کا بھی جو اَب ان کے لیے پرایا ہونے جا رہا تھا...

میں ان ہی خیالوں میں ڈوبا ہوا تھا تبھی کسی نے میرا نام پکارا۔ اب سبق سنانے کی میری باری تھی۔ اس وقت میں ماضی کے قواعد کو بہ آواز بلند، بنا رکے ایک سانس میں پڑھنے کے لیے اپنا سب کچھ قربان کرنے کے لیے تیار تھا۔ لیکن ابتدائیہ الفاظ میں ہی میری زبان لڑکھڑا گئی۔

میں ٹوٹے ہوئے دل سے، منہ لٹکائے اپنی بنچ پر توازن قائم رکھنے کی کوشش کرنے لگا۔ پھر میں نے سنا ماسٹر آمیل مجھ سے کچھ کہہ رہے تھے:

"میرے پیارے فرانز اب میں تمھیں نہیں ڈانٹوں گا۔ تم پہلے ہی بہت سزا پا چکے ہو۔ بس اب بہت ہو گیا۔ ہم روز یہی کہتے ہیں کہ ابھی تو بہت وقت ہے کل پڑھ لیں گے۔ اور پھر تم ہی دیکھو کیا ہوتا ہے۔ آہ، ہمارے آلزاس کی یہی سب سے بڑی بدنصیبی رہی ہے کہ ہم نے ہمیشہ پڑھائی کو کل پر ٹال دیا ہے۔ اب دوسرے لوگ بھی ہم سے اپنی بات کہنے میں حق بجانب ہیں کہ کیسے ہم اپنے فرانسیسی ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں، جب کہ ہمیں نہ تو درستی سے اپنی زبان بولنا آتی ہے اور نہ ٹھیک سے لکھنا...ان سب کے لیے میرے فرانز تم اکیلے ذمہ دار نہیں ہو، کہیں نہ کہیں ہم سب اس کے ذمہ دار ہیں۔ آپ کے ماں باپ نے آپ کو پڑھانے لکھانے میں کبھی کوئی خاص دل چسپی نہیں دکھائی۔ ان کا زیادہ رجحان تمھیں کھیتوں میں یا کارخانوں میں بھیج کر کام کرانے میں رہا، تاکہ دو پیسے کی آمدنی زیادہ ہو جائے۔ اور کیا میں بھی دھتکار کے قابل نہیں ہوں؟ کیا میں نے کلاس لینے کے بجائے تم لوگوں سے اپنے باغ کی گھاس اکھاڑنے اور پانی دینے کے لیے نہیں کہا؟ اور جب کبھی مجھے ٹراؤٹ مچھلی کے شکار کی خواہش ہوئی تو کیا مجھے تمھیں چھٹیاں دینے میں ذرا بھی تذبذب ہوا؟"

ایسے ہی ایک ایک کر کے ماسٹر آمیل نے پھر ہمیں فرانسیسی زبان کے بارے میں بتانا شروع کیا۔ انھوں نے کہا کہ یہ دنیا کی سب سے

خوبصورت زبانوں میں سے ایک ہے۔ یہ سب سے زیادہ ٹھوس اور مطلب کو واضح کرنے والی ہے۔ انھوں نے مزید کہا کہ اسے ہمیشہ اپنے مابین باقی رکھنا اور کبھی مت بھولنا۔ کیونکہ ایک قوم جب غلام بنائی جاتی ہے، تو جب تک ان کی زبان ان کے پاس ہوتی ہے گویا ان کے پاس ان کی آزادی کا پروانہ ہوتا ہے۔

اس کے بعد انھوں نے گرامر کی ایک کتاب اٹھائی اور سبق شروع کیا۔ میں بہت حیران تھا کیونکہ ان کی ساری باتیں میری سمجھ میں آرہی تھیں۔ جو کچھ بھی وہ کہے جا رہے تھے، وہ حد درجہ آسان تھا۔ مجھے یہ بھی احساس ہوا کہ میں نے کبھی ان کی بات کو اتنا دل لگا کر نہیں سنا تھا اور نہ ہی وہ اس سے پہلے کسی بات کو سمجھانے میں اتنے صابر دکھائی دیے تھے۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے یہاں سے رخصت ہونے سے پہلے وہ اپنے علم کا سارا خزانہ ہماری جھولی میں انڈیل دینا چاہتے ہوں۔ اور ہمیں سب کچھ ایک کلاس میں ہی سمجھا دینا چاہتے ہوں۔

سبق ختم کر کے ہم نے لکھنا شروع کیا۔ اس دن کے لیے ماسٹر آمیل نے ہمارے لیے خاص طور پر نئی نئی کاپیاں تیار کی تھیں جن پر موٹے موٹے اور خوبصورت حرفوں میں لکھا ہوا تھا فرانس آلزاس، فرانس آلزاس۔ ایسا سماں بندھ گیا تھا جیسے اسکول کے ہر ڈیسک میں سینکڑوں جھنڈے باندھ دیے گئے ہوں اور وہ خوشی سے جھوم رہے ہوں... میں صاف محسوس کر رہا تھا کہ کیسی لطیف و جمیل خاموشی چھائی ہوئی ہے اور ہر طالب علم پوری لگن کے ساتھ اپنے کام میں محو تھا۔ ہمیں صفحوں پر گھستے قلم کی کر کراہٹ کے سوا کچھ بھی سنائی نہیں دے رہا تھا۔ تبھی کچھ بھنورے کلاس میں داخل ہوئے لیکن کسی نے ایک آنکھ اٹھا کر بھی ان کی طرف نہیں دیکھا۔ ننھے منھوں نے بھی نہیں جو اپنی کاپیوں پر آڑی ترچھی لکیریں کھینچنے کے شوقین تھے۔ ایک ایسی دلی امنگ اور روشن خیالی کے ساتھ کہ ایسا لگتا تھا جیسے یہ سب کچھ فرانسیسی کا ہی حصہ بن گیا ہو۔ چھت کی منڈیر پر کبوتر مدھم آواز میں غٹرغوں کر رہے تھے، انھیں سن کر میں سوچنے لگا:

"کیا انھیں بھی جرمن زبان میں غٹرغوں کرنے پر مجبور کیا جائے گا؟"

دفعتاً میری نگاہ صفحے سے اٹھ کر ماسٹر آمیل کی طرف گئی۔ میں نے دیکھا وہ چپ چاپ اپنی کرسی میں بیٹھے اپنے آس پاس کی چیزوں کو ٹکٹکی لگائے دیکھے جا رہے ہیں۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ اس چھوٹے سے کمرے کی ہر چیز کو اپنی نگاہوں میں سمولینا چاہتے ہوں۔ ذرا غور کیجیے پچھلے چالیس سال سے وہ اسی جگہ پر تھے۔ وہی صحن، وہی کلاس سب کچھ وہی کا وہی۔ صرف بنچ اور ڈیسک پر پالش کردی گئی تھی جو کثرت استعمال سے گھس گئے تھے۔ آنگن میں اخروٹ کے پیڑ بھی کافی بڑے ہو گئے

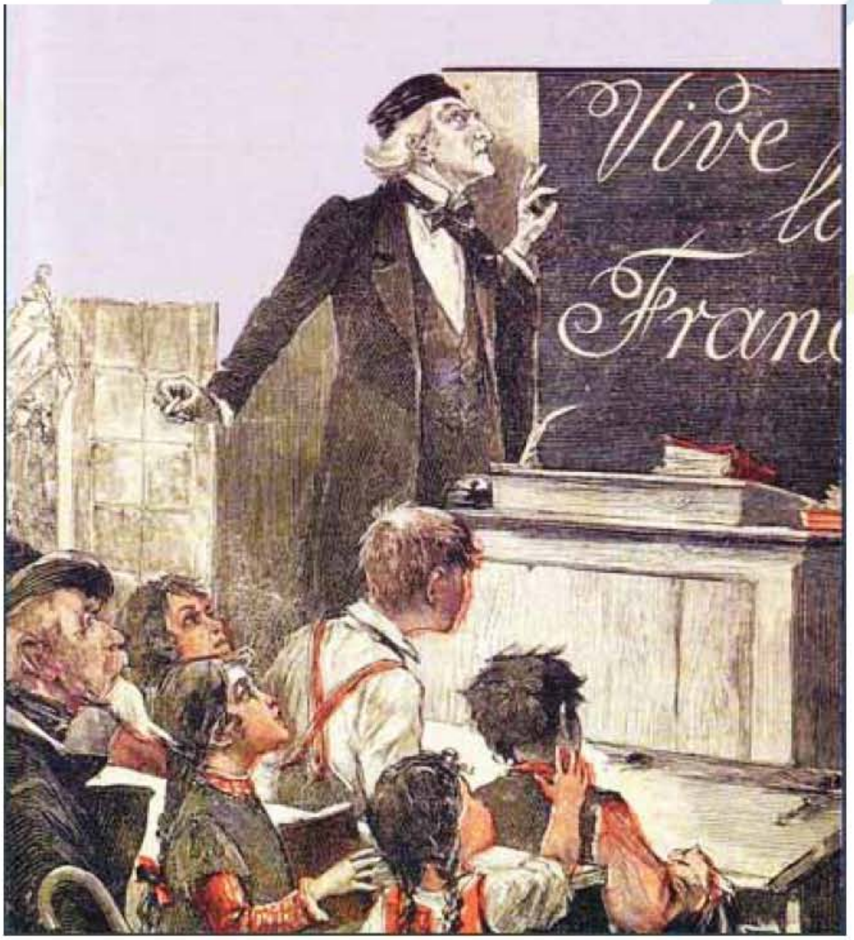

تھے اور انگور کی بیلیں جنھیں خود وہ اپنے ہاتھوں سے لگائے تھے کھڑکی سے ہوتے ہوئے چھت تک پہونچ گئی تھیں۔ انھیں یہ سب کچھ چھوڑ کر چلے جانے پر کتنا دکھ ہو رہا ہوگا۔ اوپر والے کمرے میں سامان باندھ رہی ان کی بہن کے قدموں کی آہٹ سن کر انھیں کتنی تکلیف ہو رہی ہوگی۔ کیونکہ انھیں کل رخصت ہونا تھا اور ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اس ملک سے کوچ کر جانا تھا۔ پھر بھی انھوں نے پوری ہمت جٹا کر کلاس کو انجام تک پہونچایا۔ لکھائی کے بعد ہم نے تاریخ کا سبق پڑھا۔ اس کے بعد ننھے منّوں نے ایک ساتھ با، بے، بی، بُو، بَو کے نغمے گائے۔ وہاں... کلاس کے دروازے کے قریب بیٹھے بڑے میاں اوزے مضبوطی سے اپنے ہاتھوں میں ہجّی کی کتاب تھامے ہوئے بچوں کے ساتھ حروف دہرائے جا رہے تھے۔ دیکھنے سے لگ رہا تھا کہ وہ بھی پوری لگن کے ساتھ ان حروف کو سیکھنا چاہ رہے تھے۔ ان کی آواز احساسات سے پُر تھی اور تھرا رہی تھی جسے سن کر ہنسنے اور رونے دونوں کو جی چاہتا تھا۔ آہ، میں اس آخری سبق کو تاحیات یاد رکھوں گا...

تبھی اچانک گرجا گھر کی گھڑی نے بارہ بجائے۔ ٹھیک اسی لمحہ جرمن فوجیوں کی نعلیں جو پریڈ سے واپس آ رہے تھے کھڑکی سے سنائی دیں۔ ماسٹر آمیل جن کے چہرے پر ہوائیاں اڑنے لگی تھیں اپنی جگہ سے اٹھ کھڑے ہوئے۔ کبھی بھی وہ مجھے اتنے قدآور اور عظیم نہیں لگے تھے۔

"پیارے دوستو" وہ اٹک اٹک کر بولے "میں... میں..."

لیکن گلا رندھنے کی وجہ سے ان کی آواز گھٹ کر رہ گئی۔ وہ اپنے جملے کو انجام تک نہیں لا پائے۔ تبھی وہ بلیک بورڈ کی طرف گھومے، چاک کا ٹکڑا اٹھایا اور اپنی پوری طاقت سے دبا کر جتنا موٹا اور بڑا لکھ سکتے تھے لکھ دیا:

"VIVE LA FRANCE!, فرانس زندہ باد! اپنی زبان سے کبھی رشتہ نہ توڑنا!"

پھر دیوار سے اپنا سر ٹکائے ہوئے بنا کچھ بولے ویسے ہی ساکت کھڑے رہے، اور ہاتھوں سے ہماری طرف اشارہ کیا جس کا مطلب تھا:

"بس... ختم ہوا... آپ لوگ جا سکتے ہیں..." □

Mr Abdur Rahman Ansari
106 B Lohit Hostel JNU New Delhi- 110067

کی ہے جن کا رنگ جامنی یا بینگنی ہے۔ پتہ نہیں سائنس دانوں نے یہ رنگ چن کر بے چارے بینگن کی عزت بڑھائی ہے یا کچھ اور گھٹادی ہے۔ بینگنی ٹماٹر کی البتہ یہ ایک بڑی خوبی ہے کہ اس کے رس میں ایسے کیمیکل شامل ہیں جو کینسر سے بچاتے ہیں۔ ویسے اپنے ہندوستانی سائنس داں بلکہ تھوڑے سے پڑھے لکھے باغبان بھی کسی کم نہیں جو زیادہ عرصے تک نہ سڑنے والے ٹماٹر، لمبے اور میٹھے کیلے، اور سیکڑوں قسم کے آم محض قلم لگانے کے ہنر سے اگا چکے ہیں۔

ریت اور جدید آرٹ: امریکی آرٹسٹ کیلون Calvin کا سمندر کے کناروں پر ریت سے جدید آرٹ کے نمونے بنانے میں کوئی جواب نہیں۔ پچھلے 30 برسوں سے وہ اس کام میں لگے ہیں اور اب تک ہزاروں ماڈل بنا کر دنیا بھر میں اپنے فن کا لوہا منوا چکے ہیں۔

اونچائیوں سے کھیلنے والی: یہ خاتون بلند و بالا عمارتوں کے اوپر جا کر فوٹوگرافی کرنے کی شوقین ہیں۔ 25 سالہ لوسنڈا گریج امریکہ کی بلند عمارت کرسلر بلڈنگ کی 61 ویں منزل پر چڑھی ہوئی ہیں اور ان کی یہ تصویر ان کے ہم پیشہ دوست الیکس شا نے کھینچی ہے۔ نیچے مصر کے اہراموں کی جو تصویر لوسنڈا نے کھینچی ہے وہ گیزا کی عمارت کی چوٹی سے لی گئی ہے جہاں ان کے دوست کو دیکھا جا سکتا ہے۔

لندن میں سب سے مہنگا کرائے کا مکان: ہر طرح کے عیش و آرام سے سجے ہوئے لندن کے اس مکان کا بیڈروم بھی اتنا بڑا ہے کہ اس میں اچھا خاصا ایک بڑا گھر سما جائے۔ اور مکان کا کرایہ؟ خدا کی پناہ۔ 7 لاکھ 80 ہزار پاؤنڈ سالانہ۔ یعنی صرف 66 لاکھ 41 ہزار 615 روپے ماہانہ یا سوا دو لاکھ روپے روزانہ! اس میں 5 بیڈروم ہیں ایک فیملی کچن، ایک وسیع باغ اور کل رقبہ 18346 مربع فٹ!

آگ کا میلہ: دنیا میں طرح طرح کے میلے ہوتے ہیں۔ لیکن برطانیہ کے شہر شیٹ لینڈ میں ہر سال ایک آگ کا میلہ ہوا کرتا ہے جس

دنیا کی سب سے کم اونچی کار: برطانیہ کے ایک کار ڈیزائنر نے یہ کار صرف اس لیے ڈیزائن کی کہ دنیا کی سب سے نیچی کار کا عالمی ریکارڈ قائم کر سکے۔ اس کی اونچائی اس کے پہیوں کے برابر یعنی صرف 19 انچ ہے۔ مشہور ہالی وڈ فلم بیٹ مین کی بیٹ موبائل گاڑی سے متاثر ہو کر ڈیزائن کی گئی یہ کار کچھ زیادہ مہنگی بھی نہیں۔ بروک لینڈ ایک نیلام میں یہ صرف 9775 پاؤنڈ یعنی 10 لاکھ روپے میں فروخت ہو گئی۔ اس میں جیٹ انجن لگا ہے اور اس سے آگ کا شعلہ بھی نکل سکتا ہے۔ بائیں جانب اس کی کچھ اور تصویریں دیکھیے جو اوپر اور نیچے سے لی گئی ہیں۔

میں لوگ وائکنگ کے روایتی لباس میں بیچوں بیچ جمع ہوتے ہیں اور سمندری لٹیروں کی کشتی کے ایک ماڈل کو آگ لگا کر وائکنگ چارل اسکواڈ نام کے اس سمندری لٹیرے کی یاد دلاتے ہیں جس نے 9ویں صدی میں یوروپی ساحلوں پر حملہ کیا تھا۔ یہ میلہ 18ویں صدی میں شروع ہوا تھا اور اسے Up Helly Aa Fire Festival کہتے ہیں۔

برش نہیں انگلیاں: امریکی ریاست نیویارک کی زاریہ فورمین ایک ایسی پینٹر ہیں جو انسانی ہاتھ کی انگلیوں کو برش سے بھی اچھا مصوری کا اوزار مانتی ہیں۔ وہ پینٹ میں انگلیاں ڈبوتی ہیں اور کچھ ہی دیر میں ان کی پینٹنگ تیار ہو جاتی ہے۔ سمندر اور پہاڑ بنانے میں زاریہ خاص مہارت رکھتی ہیں۔ اس طرح وہ اب تک ہزاروں پینٹنگز بنا کر دنیا بھر میں نام کما چکی ہیں۔ وہ اپنے فن کا مظاہرہ تماشائیوں کے سامنے بھی کر چکی ہیں۔

غضب کی شعبدہ بازی: ایسا کرتب شائد ہی کبھی آپ نے دیکھا ہو۔امریکہ میں ہیوسٹن کے یہ نوجوان ایک ساتھ ہوا میں بہت سی چیز اچھالتے ہیں اور پھر انھیں نیچے نہیں گرنے دیتے۔لگاتار دبوچ کر اچھالتے رہتے ہیں اور وہ بھی پوزیشن بدل کر موسیقی کی دھنوں پر۔ہے نا حیرت انگیز!

زراف میاں کی چھل قدمی: یہ زراف کا مجسمہ نہیں بلکہ ایک زندہ زراف ہے جو جنوبی افریقہ میں جوہانس برگ کے نیشنل پارک میں ایک ریستوراں میں اچانک آدھمکا۔بیس فٹ اونچا زراف آس پاس ہی تھا۔ریستوراں کی خوشبو سے ایسا متاثر ہوا کہ بذات خود معائنہ کرنے آپہنچا مگر اپنے مطلب کی کوئی چیز نہ پاکر چپ چاپ چلا بھی گیا۔

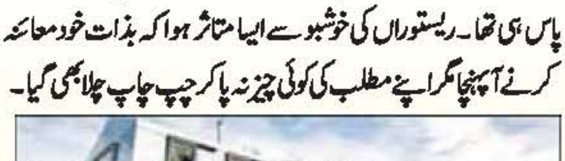

توازن کا کمال: برطانوی کاؤنٹی سفوک Suffolk میں یہ گھر ایک ڈھلان پر اس طرح بنایا گیا ہے کہ اس کا آدھا حصہ زمین پر اور آدھا ہوا میں ہے۔اسٹیل اور لکڑی سے بنائے گئے اس گھر کو جو بھی دیکھتا وہ توازن یا بیلنس کا یہ کمال دیکھ کر حیران رہ جاتا ہے۔

کچھ لو اور کچھ دو: پچھلے دنوں نیویارک کے ولیمز برگ میں دو فنکاروں وارڈ شیلی اور ایلکس شویڈر نے ایک بڑے ہیمسٹر وہیل کے اندر باہر اس طرح رہتے ہوئے 10 دن ساتھ گزارے کہ ایک کی حرکت سے پہیہ گھومتا تو دوسرے کو بھی اسی کے مطابق چلنا پڑتا۔ایلکس وہیل کے اندر نیچے تھا تو وارڈ وہیل کے باہر اوپر۔ذرا سا توازن بگڑنے پر اوپر والا گر سکتا تھا۔دونوں کی ضرورتوں کا سامان کرسی میز، فریج، کچن اور باتھ روم پہیے پر موجود تھا۔اس کرتب سے وہ یہ پیغام دینا چاہتے تھے کہ بہتر اور مفید انسانی زندگی گزارنے کے لیے آپس میں کچھ لو اور کچھ دو کا رشتہ قائم رہنا بے حد ضروری ہے۔ □

محمد رفیع انصاری

باسی عید کا مشاعرہ

بزمِ اطفال کی جانب سے 'آزاد میدان' میں عید ملن کا مشاعرہ منعقد ہوا جسے سب نے باسی عید کا بہترین مشاعرہ قرار دیا۔ طالب علم شعرا اور سامعین بڑی تعداد میں جمع تھے۔ اسٹیج کو خوب سجایا گیا تھا۔ صدر مشاعرہ بارہویں کے طالب علم خورشید جسیم بنائے گئے۔ نظامت اسی جماعت کے خالد ذہین کے ذمے تھی۔ شعرا میں ڈاکٹر فہیم، ایوب ہشیار، اسماعیل آزاد، وسیم رمضانی، حفیظ محفوظ، جاوید لڑاکو اور ممتاز شریف تشریف لائے۔

ناظم مشاعرہ یعنی اناؤنسر خالد ذہین نے مشاعرے کا آغاز کرتے ہوئے کہا "حاضرین! آپ سبھی کو عید کی طرح باسی عید بھی بہت بہت مبارک ہو۔ آج کے مشاعرے میں سب سے پہلے میں علاقے کے خوش فکر شاعر جناب ڈاکٹر فہیم سے درخواست کرتا ہوں کہ وہ اپنا کلام سنائیں۔"

ڈاکٹر فہیم مسکراتے ہوئے آئے اور اپنا تازہ کلام سنایا۔

میں بچہ ہوں مگر میں عید اس ڈھب سے مناتا ہوں
کہ سب سے پہلے سب سے پہلے اٹھ کر میں نہاتا ہوں
نظر آجاتا ہے جب چاند مجھ کو اپنی کھڑکی سے
محلے بھر کے گلیاروں میں میں بھونپو بجاتا ہوں
بنا مانگے مجھے مل جاتی ہے ہر ایک سے عیدی
ذرا سی دیر میں میں ڈھیر سا پیسہ بناتا ہوں

ڈاکٹر فہیم کو ہر شعر پر زبردست داد ملتی رہی اور وہ اپنی کامیابی سے سرشار ہو کر واہ واہ کے شور میں اپنی جگہ پر خوشی خوشی بیٹھ گئے۔

اب ایوب ہشیار کو پڑھنے کے لیے بلایا گیا۔ وہ رونی صورت بنائے

آئے۔اُن کے حلیے کو دیکھ کر لوگ اپنی ہنسی نہیں روک پائے۔ ہشیار صاحب کو یہ بات بُری لگی۔بولے ”صاحبو!ہنس لو، لیکن میری جو حالت ہے اس کا ذمہ دار میں نہیں بلکہ میرا ٹیلر ہے، میں اُسے کبھی معاف نہیں کروں گا۔عرض کیا ہے۔

مجھ کو ٹیلر ماسٹر سے ہے گِلا
کیوں مرا کرتا ہے بے ڈھنگا سِلا
نیچے اوپر ٹانک ڈالے ہیں بٹن
کیسے اب کُرتا کروں میں زیب تن
اِک گھٹا دی ، اِک بڑھا دی آستیں
جبکہ درزی ہے بڑا ہی نام چیں
عید کے دن کیا عجب آفت ہوئی
ہر خوشی ہشیار کی غارت ہوئی“

آخری شعر پڑھتے پڑھتے ہشیار کا گلا رندھ گیا۔منتظمین نے انھیں سمجھا بجھا کر اسٹیج سے نیچے اتارا۔اس دوران پورا مشاعرہ ہنسی سے لوٹ پوٹ تھا۔ ناظمِ مشاعرہ نے اب اسماعیل آزاد کو دعوتِ کلام دی۔ آزاد نے اپنی نظم سنانے سے پہلے اپنا تعارف پیش کرتے ہوئے کہا”میرا نام اسماعیل اور تخلص آزاد ہے، کیونکہ میں آزاد شاعری کرتا ہوں۔اس نام کے ایک بہت مشہور قوال بھی گزرے

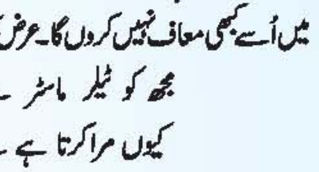

ہیں مگر مجھے اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔میری تازہ نظم ’باسی عید کو ذرا‘ غور سے سنیے۔عرض کیا ہے:

مجھے اچھی نہیں لگتی
کوئی شے جو کہ باسی ہو
بھلے زردہ، پلاؤ ہو
ہو بریانی کہ بالائی،
مگر یہ عید جس کو
لوگ باسی عید کہتے ہیں
یہ باسی ہو کے بھی
تازہ سے بڑھ کر
مجھ کو پیاری ہے،
میں باسی عید کا
بچپن ہی سے
والا و شیدا ہوں

ایک ہی سانس میں آزاد میاں نے اپنی پوری نظم پیش کردی۔نظم ختم ہونے پر دیر تک تالیاں بجتی رہیں۔اُن کے جاتے ہی مجمع سے رمضانی، رمضانی کا شور ہوا۔اناؤنسر کے کان کھڑے ہوئے،

پہلا تھا روزہ اور عجب بات ہوگئی
کچھ اس طرح کی صورتِ حالات ہوگئی
ہوٹل کے در پے پردہ نظر آیا لال لال
سوچا کہ چل کے دیکھ لیں کیا گھات ہوگئی
پردہ اٹھا کے دیکھا تو بس کچھ نہ پوچھیے!
اپنے ہی دوستوں سے ملاقات ہوگئی

آخری شعر پر محفل مشاعرہ قہقہوں میں ڈوب گئی۔ لوگوں نے اپنے اپنے دوستوں کو یاد کیا۔ خالد ذہین نے اپنے بعد حفیظ محفوظ کا نام پکارا تو سب نے دیکھا کہ ایک پتلا دبلا لڑکا شال اوڑھے سمٹا سمٹا اسٹیج پر آیا اور آتے ہی محفل پر چھا گیا۔ اس نے 'چٹ پٹی' اور پانی کے موضوع پر قطعات پیش کیے۔

مزہ افطار میں دیتا ہے پانی
نہیں دُنیا میں اِس کا کوئی ثانی
اگر، گرمی میں آئے ماہِ رمضاں
یہی بخشے دوبارہ زندگانی

دوسرا قطعہ کچھ یوں تھا:

کھانے سے جب نیت ہٹی
محفل میں تب چائے بٹی
نظریں چرا کر خوان سے
میں نے اُڑالی چٹ پٹی

چٹ پٹی کے شیدائیوں اور پانی کے فدائیوں نے بار بار ان شعروں کو پڑھوایا۔ اب باری تھی بچّوں کے استاد شاعر حضرت جاوید لڑاکو کی۔ جب ناظم نے ان کا نام لیا تو دیکھا کہ ایک نوجوان آستین چڑھائے اسٹیج سے اٹھا اور خم ٹھونکتا ہوا مائک پر آیا۔ منتظمین ڈرے کہ کہیں یہ محفل کے رنگ میں بھنگ نہ کردیں لیکن جب انھوں نے چار مصرعے پڑھنے کی خواہش ظاہر کی تو جان میں جان آئی۔ لڑاکو نے اپنا

وہ کہنے لگے، "ہاں ہاں دوستو! میں جانتا ہوں آپ رمضانی صاحب کو سننا چاہتے ہیں۔ بہت اچھی بات ہے۔ ابھی بلاتا ہوں..." چنانچہ رمضانی کو مائک پر بلایا گیا۔ رمضانی بڑی شان سے آئے اور آتے ہی جیسے پھٹ پڑے:

میں نے ہمّت کر کے پورے ماہ کے روزے رکھے
روزہ خورے منہ مرا بس دیکھتے ہی رہ گئے
پہلا روزہ تھا کڑا، اور دوسرا اس سے کڑا
اور رمضانی مجاہد بن کے ہمّت سے لڑا
صبر کرنا، کاٹنا دن کا بڑا دشوار تھا
پھر بھی خوش رہتا تھا کہ معصوم روزہ دار تھا
عید سچ مچ میرے خوابوں کی حسیں تعبیر تھی
'عید نمبر' میں چھپی میری بھی اِک تصویر تھی

رمضانی نے اپنے کلام سے مشاعرے کو بامِ عروج پر پہنچا دیا۔ موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ناظمِ مشاعرہ خالد ذہین خود اپنا کلام سنانے کے لیے آگے آئے اور کہا "میں آپ کا زیادہ وقت نہ لیتے ہوئے صرف چند مصرعے پیش کرتا ہوں۔ ملاحظہ فرمائیں۔

تجربہ بیان کرتے ہوئے کہا:

لڑاکو نے کی تھی بڑی کود پھاند
نظر 'عید' کا پھر بھی آیا نہ چاند
یہ سن کر ابھی ایک روزہ ہے اور
سبھی روزہ خوروں کے چہرے تھے ماند

اب مشاعرہ آخری منزل کے قریب تھا۔ جناب صدر کے علاوہ

بچّوں کے بڑے شاعر جناب ممتاز شریف ہی باقی تھے۔ وہ بڑی بے نیازی سے ایک گوشے میں بیٹھے ہوئے آرام کر رہے تھے۔ انھیں پکارا گیا تو اطمینان سے اٹھے اور شان سے اپنا کلام سنانے لگے:

افطار پارٹی کا سناتا ہوں تم کو حال
کیا کیف، کیا سرور تھا، کیا رنگ، کیا جمال
اس باغ میں پہنچ کے تھے دل سب کے باغ باغ
نہ کوئی مضمحل تھا، نہ تھا کوئی بھی نڈھال
پوچھا ادب سے میں نے کہ کیا سب ہیں روزہ دار
نیتا جی بولے، چپ رہو! پوچھو نہ یہ سوال

شریف صاحب کے بعد جناب صدر کی تشریف آوری کا اعلان ہوا۔ خورشید جسیم اپنے ڈیل ڈول کو سنبھالے سامنے آئے۔ اُن کو دیکھ کر ہر طرف سے 'عید مبارک' 'عید مبارک' کا شور ہوا۔ یہ منظر دیکھ کر وہ بھی جوش میں آگئے اور اپنا جوشیلا کلام سنایا:

میں کہتا ہوں، تم سب بھی کہو، عید مبارک
جس سے بھی ملو، اُس سے کہو عید مبارک
یہ عید ہے ہر شخص کی ہندو ہو کہ مسلم
ہر ایک کے گھر جاکے کہو 'عید مبارک'

ابھی صدارتی کلام ختم بھی نہیں ہوا تھا کہ 'عید مبارک' 'عید مبارک' کی صداؤں سے ساری فضا گونج اٹھی۔ اسی دوران

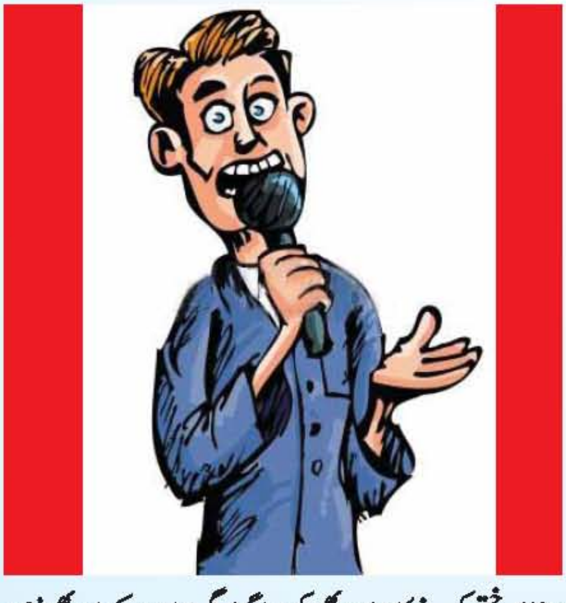

مشاعرہ ختم کرنے کا اعلان بھی کر دیا گیا۔ مگر اعلان کے بعد بھی 'عید مبارک' کی صدائیں گونجتی رہیں۔

Mr Mohd Rafi Ansari Al Madani Complex, 734 Bhosar Mohalla Bhiwandi Distt Thane -421308 Maharashtra

□ایم نصراللہ

میرے ابو کتنے اچھے

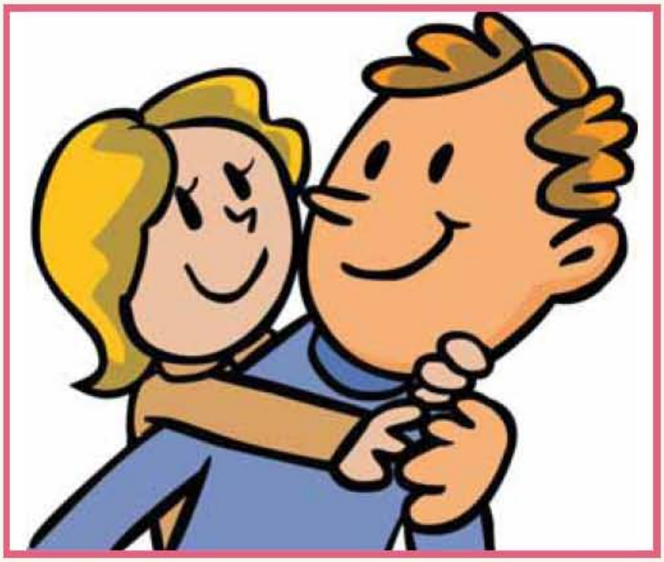

میرے ابو کتنے اچھے
من کے اجلے دل کے سچے
صبح سویرے سیر کوجائیں
دودھ جلیبی لے کر آئیں
ہو کر فارغ ہر حاجت سے
مجھ کو پڑھاتے ہیں شفقت سے
روز اسکول میں لے کرجائیں
بعد میں اپنے دفتر جائیں
شام کو خالی ہاتھ نہ آئیں
کچھ نہ کچھ تھیلے میں لائیں
کبھی دکھاتے ہیں چڑیا گھر
لے جاتے ہیں پارک میں اکثر
میری خاطر ہر دکھ سہنا
دکھ سہہ کر بھی چپ ہی رہنا
ان کے عادت کتنی پیاری
دل جیسے پھولوں کی کیاری
قول کے اپنے وہ ہیں پکے
میرے ابو کتنے اچھے

Mr M Nasrullah
Shalimar Apartment\ 3 Satyen Bose Road,
Danish Sk Lane Bakultala, Howrah - 711109 WB

اسلم آزاد

گڑیا کی شادی

رنگ برنگے کپڑے سی کر
ممی نے اک گڑیا دی ہے

آنکھیں اس کی موٹی موٹی
ناک ہے اس کی چپٹی چپٹی
بال ہیں اس کے چھوٹے چھوٹے
گال ہیں اس کے موٹے موٹے
ننھی منی اس کی چوٹی
پلکیں اس کی لمبی لمبی
گردن اس کی پتلی پتلی
کمر سے ہے وہ کافی دبلی
گاؤں سے دادی جب آئے گی
ساتھ میں گڈا بھی لائے گی
جس دن گھر میں دادی ہوگی
اس دن اس کی شادی ہوگی

رنگ برنگے کپڑے سی کر
ممی نے اک گڑیا دی ہے

میری بلّی

میری بلی میری بلی

اجلی اجلی مکھن جیسی
لمبی لمبی مونچھوں والی
نیلی نیلی آنکھوں والی
نرم، ملائم ، چکنی چکنی
کھال ہے اس کی ریشم جیسی
سردی میں ہے رنگ دکھاتی
دھوپ میں اپنی مونچھ پھلاتی
پنجوں سے وہ گیند پکڑتی
دانتوں سے پھر حملہ کرتی
چھپ کر گھات لگائے بیٹھی
چوہوں کی یہ تاک میں رہتی
جب چوہے کی آہٹ پاتی
حملہ کر کے چٹ کر جاتی
چپکے سے راتوں میں آکر
گرم رضائی میں سوجاتی
میرے جاگنے سے پہلے ہی
صبح سویرے چھو ہوجاتی

میری بلی میری بلی

Prof Aslam Azad Professor's Bunglow Rani Ghat,
Patna-800006 Bihar

□ حبیب ریتھ پوری

پہاڑ

پہاڑ کی چٹان پر اچھلتی کودتی ندی نے سر اٹھا کر پہاڑ کی طرف دیکھا اور مذاق اڑانے کے انداز سے ہنستی ہوئی کہنے لگی:

''تم بھی کیا ہو... کالی کالی پتھریلی چٹانوں کا ڈھیر، نہ ہل سکتے ہو، نہ کہیں آ جا سکتے ہو، بس برسوں سے ایک ہی جگہ کھڑے کھڑے تکتے رہتے ہو۔ نہ کسی کو کوئی فائدہ پہنچا سکتے ہو، نہ کسی کو تم سے نفع کی امید ہو سکتی ہے۔ بالکل بے حس بے جان۔ یہ بھی کوئی زندگی ہے، ذرا مجھے ہی دیکھ لو...''

پہاڑ نے اُس پتلی سی دھار کو حیرت سے دیکھا، اور خاموش رہا۔

ندی پھر کہتی رہی۔ ''میں کس طرح اچھلتی، کودتی، مسکراتی، ناچتی گاتی، شور مچاتی، اٹھلاتی، بل کھاتی، بلندیوں سے اتر کر میدان میں پہنچتی ہوں تو میرے کنارے چوڑے ہوتے جاتے ہیں۔ میرے پانی میں گہرائی اور ٹھہراؤ آجاتا ہے۔ اس صاف شفاف پانی سے

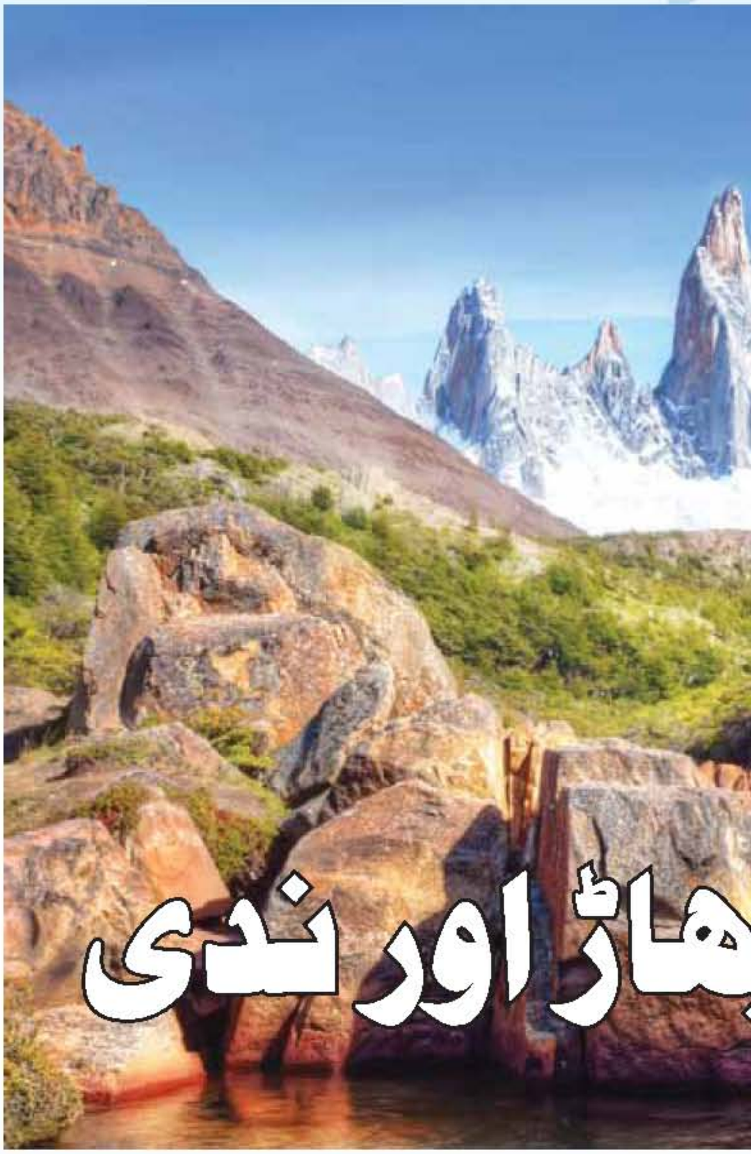

انسان جانور، چرند، پرند اپنی پیاس بجھاتے ہیں۔ اپنی دوسری ضرورتیں پوری کرتے ہیں، اور اسی لیے میرے کناروں پر گاؤں بسائے جاتے ہیں۔ بستیاں آباد ہیں، بڑے بڑے تاریخی شہر بھی میرے ہی کنارے بسائے گئے تھے۔ میں نے یہ بھی سنا ہے کہ بڑے بڑے لشکر بھی میرے ہی کنارے اترتے تھے۔ لوگ میرا ٹھنڈا میٹھا پانی پی کر سیراب ہوتے ہیں۔ کھیتوں کو سینچ کر فصلیں اگاتے ہیں۔

میری وادیوں میں اگنے والی ہری ہری نرم گھاس سے مویشی اپنا پیٹ بھرتے ہیں، اور پھر اپنے مالکوں کے لیے دودھ، دہی، گھی کی افراط سے ان کی روزی روٹی اور صحت کا سامان کرتے ہیں'' ندی ذرا چپ ہوئی۔ مگر پہاڑ اب بھی خاموش ہی رہا۔ آخر وہ پہاڑ تھا۔ صبر و تحمل کا پہاڑ، قوت برداشت کی علامت۔

تھوڑی دیر چپ رہنے کے بعد ندی پھر کہنے لگی اب تو میرے پانی کا استعمال کئی کئی طرح سے ہونے لگا ہے۔ بڑے بڑے بندھ باندھ کر ڈیم تیار کیے جا رہے ہیں۔ میرا پانی روک کر مختلف مشینوں کے ذریعہ بجلی پیدا کی جا رہی ہے جو روشنی اور کارخانوں میں توانائی کی ضرورت کو پورا کرتی ہے۔ آبی توانائی کی ضرورت اور اہمیت کو دنیا سمجھ چکی ہے۔ اس لیے اب میری حفاظت بھی کی جانے لگی ہے۔ ناؤ، کشتیاں اور بحری بیڑے بھی میرے ہی دم سے چلتے ہیں۔ غذائی سامان اور دوسری چیزیں بھی میری گہرائیوں سے نکالی جاتی ہیں جب کہ تم ہو کالی کالی سخت چٹانوں کا ڈھیر۔ تمھارے دامن میں گھنے جنگل اور جھاڑیاں اگے ہیں، جہاں سورج کی روشنی بھی پہنچ نہیں سکتی۔ بس اندھیرا ہی اندھیرا، بھیانک اندھیرا، ڈراؤنا اندھیرا۔''

ندی کی باتیں سن کر پہاڑ نے متانت اور سنجیدگی سے جواب دیا۔

''ٹھیک کہتی ہو بیٹی!''

بیٹی کا لفظ سن کر ندی چونک پڑی۔

پہاڑ بڑی نرمی، بردباری اور صبر و تحمل سے اپنی پاٹ دار آواز میں کہنے لگا۔ ''چونکو نہیں! تم میری ہی بیٹی ہو، میں ہی تمہارا باپ اور تمہاری ماں ہوں۔ میری ہی کوکھ سے تمہارا جنم ہوا ہے اور میری ہی وجہ سے تمہارا وجود قائم ہے، ورنہ تم خود کچھ نہیں ہو۔ مجھے تمہاری باتیں سن کر ذرا بھی برا نہیں لگا۔ کوئی رنج نہیں ہوا۔ غصہ بھی نہیں آیا۔ کیونکہ نادان بچوں کی نادانی کی باتوں سے بزرگوں کو کبھی غصہ نہیں آتا۔ ہاں ان کی نادانی پر ہنسی آتی ہے جس سے پیار اور بڑھ جاتا ہے، مجھے بھی نہ تو غصہ ہوا نہ رنج۔ کیونکہ تم نادان ہو۔ اپنے وجود سے انجان...'' پہاڑ خاموش ہو گیا۔

اب ندی نے اچھل کر اور پلٹ کر دیکھا۔

پہاڑ اپنی جگہ ساکت اور جما ہوا کھڑا تھا۔ ایک بار پھر وہ اپنی گونجتی ہوئی آواز میں بولا:

"تمھارا وجود، میری کالی سخت چٹان سے پھسلتی ہوئی بارش کی پہلی بوند ہے۔ پھر ان چٹانوں پر بارش کی بوندیں گرتی رہیں، اور پھسل پھسل کر تم کو آگے بڑھاتی رہیں، اور تم بہنے لگیں۔ میرے بدن سے پھوٹنے والے سوتوں اور جھرنوں نے تم کو پال پوس کر بڑا کیا۔ جب تک تم میری گود میں تھیں چھوٹے بچوں کی طرح اچھلتی کودتی شور مچاتی رہیں۔ کھیلتی، ناچتی گاتی رہیں۔ کیونکہ میری گود میں تمھیں پوری طرح حفاظت کا احساس تھا۔ مگر جیسے ہی تم میدانی علاقے میں پہنچیں، تمہارا اچھلنا کودنا، ناچنا، گانا، شور مچانا سب کچھ بند ہوگیا۔ اب تم خاموش بہنے لگیں۔ شاید تم کو کچھ سمجھ آ گئی تھی، یا اپنے محفوظ نہ ہونے کا احساس ہوگیا تھا۔ تم سنجیدہ ہوگئیں، مگر میں یہاں بھی تمھارے وجود کا محافظ بنا رہا۔ مجھ سے دور ہو کر بچھڑنے کے باوجود مجھے تمھارے وجود کی فکر تھی اور میں تمھاری غذا تمھیں برابر پہنچاتا رہا۔ تاکہ تمھارا وجود ختم نہ ہوجائے۔ تم سوکھو نہیں۔ مگر تم مجھے بھولنے لگی تھیں۔ اپنے وجود کی بنیاد کو بھولنے لگی تھیں، لیکن میں تمھیں نہیں بھولا تھا۔

"یہ سچ ہے کہ تمہارے پانی سے انسان، چرند پرند پیاس بجھاتے ہیں۔ سیراب ہوتے ہیں۔ کھیتوں میں آب پاشی ہوتی ہے۔ فصلیں اگائی جاتی ہیں۔ وادیوں میں اُگی گھاس سے مویشی پیٹ بھرتے ہیں۔ پانی ملنے کی سہولت سے گاؤں آباد ہوتے ہیں۔ شہر بسائے جاتے ہیں۔ لشکر بھی تمہارے کنارے اترے ہیں یہ بھی تاریخ ہے۔ ڈیم بنا کر پانی کا بہاؤ روک کر کئی طریقوں سے کام میں لایا جاتا ہے۔ آبی توانائی کی اہمیت سبھی قبول کر چکے ہیں۔ غذائی اجناس اور دیگر چیزیں بھی تمھاری گہرائی میں ہوتی ہیں۔ ناؤ، کشتی، سمندری بیڑے بھی تمھاری وجہ سے چلتے ہیں۔ مگر یہ سب کس کے دم سے ہے ذرا یہ بھی تو سوچو؟

"تم تو ذرا ذرا سی بات پر غصہ ہو کر آپے سے باہر ہو جاتی ہو، اور جب تم کو غصہ آتا ہے تو اپنے کناروں کو توڑ کر اپنی حدوں کو چھوڑ کر آبادی میں گھستی ہو۔ بستیوں کو ڈبو دیتی ہو، فصلوں کو تباہ کر دیتی ہو۔ اس پر بھی تمھارا غصہ کم نہیں ہوتا تو آبادیوں کو نگل جاتی ہو۔ آگ لگنے پر بھی کچھ تو بچایا جاسکتا ہے مگر تمھارا پانی تو سب کچھ بہا کر لے جاتا ہے۔ جان اور مال دونوں کا صفایا کر دیتی ہو۔ مگر میرا معاملہ ایسا نہیں ہے۔ تمھارا پانی صاف شفاف صحت بخش اس وقت تک ہے جب تک تم میری گود میں ہو۔ میری سخت چٹانوں میں طرح طرح کے نمک اُسے صحت بخش بناتے ہیں۔ میدان میں پہنچتے ہی آبادیوں کی گندگی تمہارے پانی کو خراب کر دیتی ہے۔ کارخانوں سے نکلنے والے طرح طرح کے کیمیکل تمہارے پانی کو زہریلا بنا دیتے ہیں اور پھر اسے کئی طرح کے کیمیائی عمل سے گذار کر ہی پینے کے قابل بنایا جاسکتا

ہے ڈیم تو انسان اپنی ذخیرہ اندوزی کی فطرت کے تحت بناتا ہے۔ جس نے تمھاری فطری آزادی بھی چھین لی ہے اور تم اس پر بھی فخر کر رہی ہو... یہ بھی تو نادانی ہی ہے۔

''ہاں یہ صحیح ہے کہ میری کالی سخت چٹانیں مجھ پر اگے ہوئے گھنے جنگل اور جھاڑیاں، اونچے اونچے پیڑ پودے، اور ڈھلانیں جہاں سورج کی کرنیں بھی پہنچ نہیں سکتیں۔ مگر یہی گھنے جنگل کتنے ہی چوپایوں، درندوں کی پناہ دیتے ہیں، اور وہ محفوظ رہتے ہیں اور قدرت کے نظام کو برقرار رکھے ہوئے ہیں۔ عمارتی لکڑی، دواؤں کی جڑی بوٹیاں، شہد، گوند اور اس جیسی کتنی ہی نعمتیں میرے ان جنگلوں سے ہی میسر آتی ہیں۔

''میری یہ کالی چٹانیں بظاہر کالی اور سخت دکھائی دیتی ہیں۔ مگر ان میں کئی طرح کے پتھر بھی ہوتے ہیں۔ جن کے لیے انسان اپنی لالچی فطرت کے تحت کھدائی کر کے اپنی تباہی کا سامان کر رہا ہے۔

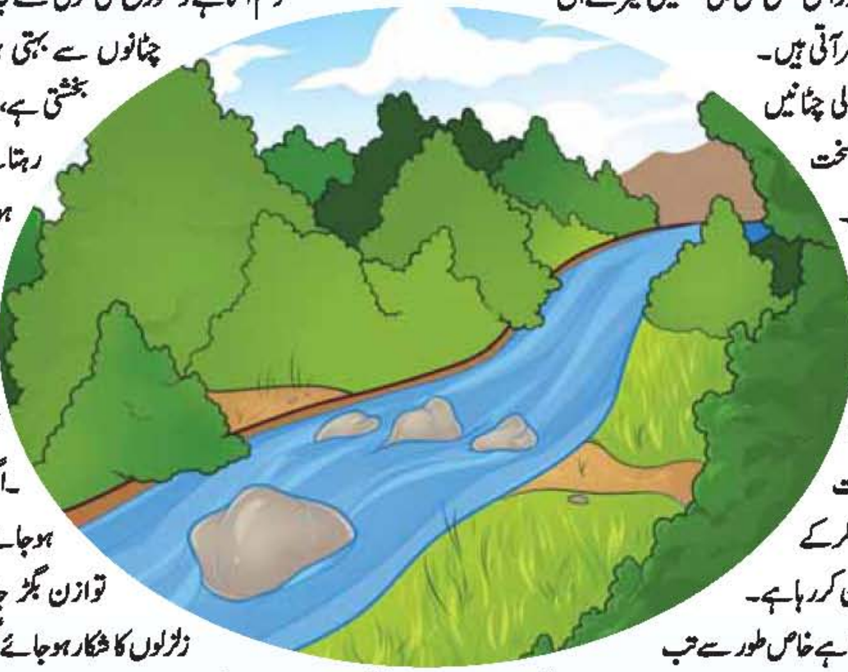

غصہ تو مجھے بھی آتا ہے خاص طور سے تب جب انسان بے جا طور پر میرا ستیاناس کرنا چاہتا ہے۔ جنگل کاٹتا ہے، کھدائی کرتا ہے۔ جب مجھے غصہ آتا ہے تو میں آتش فشاں بن کر پھٹ پڑتا ہوں۔ کچھ دن آگ اگل کر پھر پرسکون ہو جاتا ہوں۔ مگر میرے غصے سے نقصان کم اور فائدے زیادہ ہوتے ہیں۔ میرے اندر جو خزانے چھپے ہیں میں انھیں لٹا دیتا ہوں... جس سے انسانوں کو فائدہ ہی ہوتا ہے۔ پانی سے ملنے والی غذائیں اور دوسری نعمتیں سب کچھ تمھارے دم سے میسر آتی ہیں۔ لیکن اگر میں تمھاری پرورش سے ہاتھ اٹھا لوں تو تم یتیم اور اناتھ ہو جاؤ گی۔ یہ ساری نعمتیں ختم ہو جائیں گی جن پر تم کو ناز ہے۔

''آؤ! ایک بار پھر تمھیں تمھارے وجود کی حقیقت بتا دوں۔ یہ میری بلند و بالا چوٹیاں ہی ہیں، جو گھنے بادلوں کو روکتی ہیں، اور میری ٹھنڈی ہوا انھیں برسنے پر مجبور کر دیتی ہے۔ جس بھاپ کے یہ بادل بنے ہوتے ہیں وہ دوبارہ پانی بن جاتی ہے جس سے بارش ہوتی ہے اور تم وجود میں آتی ہو۔ سردیوں میں جب برف گرتی ہے تو میری بے حد ٹھنڈی فضا اس پانی کو برف بنا کر جمع کر لیتی ہے اور پھر جب گرمی کا موسم آتا ہے تو سورج کی گرمی سے یہ برف پگھل کر پھر چٹانوں سے بہتی ہوئی تمھیں زندگی بخشتی ہے، اور تمھارا وجود قائم رہتا ہے اور تم بہتی رہتی ہو۔ ذرا غور کرو، میں زمین پر قدم جمائے کھڑا ہوں اسی لیے تو زمین کا توازن برقرار ہے۔ اگر میرا وجود ختم ہو جائے تو زمین کا توازن بگڑ جائے گا اور زمین زلزلوں کا شکار ہو جائے گی، اور پھر کچھ بھی باقی نہیں بچے گا۔ تم بھی نہیں۔''

پہاڑ اتنا کہہ کر خاموش ہو گیا۔ ندی کو اپنی حقیقت، اپنے وجود کی بنیاد سے آگاہی ہو گئی تھی۔

پانی پر تیرتے بلبلوں نے حیرت سے آنکھیں پھاڑ کر دیکھا، تو ندی کی آنکھوں میں آنسوؤں کے قطرے تیرنے لگے تھے اور وہ شرم سے پانی پانی ہوئی جا رہی تھی۔ □

Mr Habeeb Reethpuri Adv. Reethpur, Distt Amravati - 444704 Maharashtra.

□ محمد اطہر مسعود خاں

ایک ہی صف میں...

”تم سب خطا کار اور مجرم ہو۔“ بادشاہ محمود نے گرج کر سارے درباریوں سے کہا ”تم نے شاہی خزانے کا زبردست نقصان کیا ہے۔اس لیے ہم تم سب کو سزا دیں گے اور تمہارے اوپر جرمانہ بھی ڈالا جائے گا۔“

سارے درباری شرم سے نظریں نیچی کیے، سر جھکائے اور ہاتھ باندھے بادشاہ محمود کے سامنے کھڑے ہوئے تھے، انھوں نے بادشاہ سلامت کو آج سے پہلے اتنا غضب ناک، اتنا قہر زدہ اور ایسے شدید غصے میں کبھی نہیں دیکھا تھا۔ ان کے تو وہم وگمان میں بھی نہ تھا کہ وہ جس بادشاہ کی خوشامد کے طور پر کان بھر رہے تھے وہ ایک چھوٹی سی بات کی خاطر اتنا ناراض ہو جائے گا۔

درباریوں کی ناراضی تو بادشاہ کے چہیتے غلام ایاز سے تھی، جس کو بقول ان لوگوں کے بادشاہ نے اپنے سر پر چڑھا لیا تھا، وہ جو کچھ کہتا بادشاہ محمود ویسا ہی کرتا۔ وہ جس بات کا مشورہ دیتا، بادشاہ اسی کے مطابق عمل کرتا، آخر انھوں نے کیا برا کیا تھا۔ محض حقیقت بیانی ہی تو کی تھی، جس کا بادشاہ نے غلط مطلب لیا تھا اور ان کا امتحان لے ڈالا تھا۔ اب امتحان میں کامیابی ناکامی تو لگی ہی رہتی ہے۔ کچھ ناکام ہوتے ہیں کچھ کامیاب۔ ایسا تو کبھی نہیں ہوتا کہ سب ہی ناکام یا سب ہی کامیاب ہو جائیں۔ لیکن بادشاہ کسی کی دلیل سننے کے لیے تیار ہی کب تھا۔

بادشاہ تو یوں بھی معمولی شخصیت کے مالک نہیں ہوتے۔ ان کے اندر تو بڑی شجاعت اور بہادری، ہمت اور دلیری، فہم اور فراست ہوتی ہے۔ تبھی تو وہ بادشاہ بنتے اور لوگوں پر حکومت کرتے ہیں، پھر محمود جیسا بادشاہ تو بڑا سخی، بڑا عادل، بڑا نیک و پارسا، بڑا عابد و زاہد اور مخلوق خدا سے محبت کرنے والا اور ان کے حقوق کو ادا کرنے والا تھا۔ وہ لوگوں

کے ساتھ ناانصافی کرے، یہ تو کسی کی بھی سمجھ میں نہ آتا تھا۔

ایاز بے شک محمود کا غلام تھا لیکن وہ ایسا غلام نہیں تھا جس کی لاتوں اور گھونسوں سے مرمت کی جاتی ہے، وہ تو بادشاہ کا ایسا غلام تھا جس پر بادشاہ کو ناز تھا، جس کی قیمت بادشاہ کے نزدیک ہیرے موتیوں سے زیادہ تھی۔ ایاز بادشاہ کا رازدار تھا۔ اس کی تنہائیوں کا ساتھی اور اس کی پریشانیوں کو سمجھنے والا انسان تھا۔ راتوں کو اٹھ کر تہجد کی نماز پڑھتا اور سجدے میں سر رکھ کر پروردگار عالم کے حضور، بادشاہ سلامت کی صحت وتندرستی ، اس کی راحت وسلامتی کی دعائیں مانگا کرتا۔ اللہ تعالیٰ سے اپنے بادشاہ کے لیے بھلائی اور خیر کی دعائیں مانگتا۔ پھر کوئی بتائے کہ ایسے غلام پر کون بادشاہ ناز نہ کرتا۔ لہٰذا محمود کو بھی ایاز سے ایسا ہی پیار تھا۔ ایاز کے بغیر اس کی زندگی ادھوری اور نامکمل تھی، وہ ذاتی اور ملکی معاملات میں ایاز سے مشورے طلب کیا کرتا اور کسی حد تک ان پر عمل بھی کرتا۔

بس یہی بات تھی جو سارے درباریوں کو کانٹے کی طرح کھٹکتی تھی، ان کا خیال تھا کہ دو ٹکے کے غلام کو بادشاہ نے اپنے سر پر چڑھا لیا ہے۔ جیسا وہ کہتا ہے بادشاہ سلامت ویسا ہی کرتے ہیں حتیٰ کہ ذاتی اور نجی معاملات میں بھی ایاز کا عمل دخل اور اثر ورسوخ کافی تھا۔ لیکن

▲ ایک پرانی پینٹنگ جس میں تخت پر دائیں ایاز کو محمود غزنوی کے ساتھ بیٹھے ہوئے دکھایا گیا ہے

ایسا نہیں تھا کہ بادشاہ کو ان باتوں سازشوں اور اعتراضات کا علم نہیں تھا۔ بادشاہ سب کچھ جانتا تھا لیکن اپنے مرتبے اور حیثیت کے مطابق بہت سی باتوں کو نظر انداز کر دیا کرتا تھا۔ عدل وانصاف اس کے مزاج میں کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا۔ اس لیے وہ نہیں چاہتا تھا کہ کسی پر بے وجہ اپنی ناراضی کا اظہار کرے یا اس کو سزا دے۔ معاف کرنے کی تو اس کی ایسی عادت تھی کہ وہ سزا یافتہ لوگوں سے بھی خوش دلی اور نرم روی سے پیش آیا کرتا تھا، پھر وہ کسی کے کان بھرنے سے لوگوں کو سزا یا عتاب کیسے دیتا۔

لیکن بات جب حد سے بڑھ گئی پانی سر سے اونچا ہو گیا، لوگوں کی سازشیں آسمان کو چھونے لگیں، اعتراضات کی بارش ہونے لگی اور طنز کے نشتر اس کے دل کے پار ہونے لگے تو اس نے ایک فیصلہ کر لیا کہ میں بھرے دربار میں اس بات کی جانچ کروں گا کہ ایاز کے اندر واقعی کون سی خوبی ہے جو میں سب سے زیادہ اسے چاہتا ہوں اور پھر میں لوگوں کو بھی دکھاؤں گا کہ دیکھو ایاز کے اخلاق وعادات کتنے اعلیٰ وافضل ہیں جن کے باعث میں اسے چاہتا ہوں اور جان چھڑکتا ہوں۔

بادشاہ کا فرمان جاری ہوا کہ فلاں تاریخ کو ہمارے سارے درباری، دربار میں حاضر ہوں تاکہ ہم ایاز کے ساتھ سارے لوگوں کا امتحان لے سکیں اور لوگوں کو بتا سکیں کہ تم میں سے بھی کوئی ایاز کی طرح ہے یا نہیں؟ یا

ایک اور پرانی پینٹنگ میں محمود (سرخ لبادے میں) جب وہ داڑھی نہیں رکھتا تھا، ایران کے شاہ عباس سے مصافحہ کرتے ہوئے، اس کے پیچھے سبز لبادے میں ایاز کھڑا ہے

لوگوں سے کھچا کھچ بھر گیا تو بادشاہ نے اپنے ملازموں کو حکم دیا کہ سارے درباریوں اور یہاں موجود سارے ہی مہمانوں کے ہاتھوں میں نہایت قیمتی شیشے کے جام یعنی گلاس دے دیے جائیں۔ جام اپنی نفاست اور خوبصورت نقش ونگار سے جھلملا رہے تھے اور ہر شخص کا جی چاہتا تھا کہ اس گلاس کو ہمیشہ اپنے پاس ہی رکھے۔ اتنے میں بادشاہ نے دریافت کیا کہ سب لوگوں کے ہاتھ میں جام آگئے یا نہیں۔ یہ سن کر سبھی نے جام والے ہاتھ اوپر اٹھالیے۔ گلاسوں کی چمک سے سارا دربار چمک اٹھا لیکن بادشاہ نے اسی درمیان حکم دیا کہ سارے جام فرش پر پٹخ کر توڑ دیے جائیں۔ دربار میں سارے لوگوں کے ہاتھ اٹھے کے اٹھے رہ گئے۔ ان کے چہروں پر ہوائیاں اڑنے لگیں اور منہ حیرت سے کھلے رہ گئے کہ بادشاہ سلامت نے یہ کیا عجیب حکم دے دیا۔ بھلا اس قدر قیمتی گلاس کیوں توڑ دیے جائیں؟

تم ویسے ہی ایاز کو بدنام کرنے کی سازشیں کرتے رہتے ہو۔

مقررہ تاریخ پر سارے درباری، بادشاہ محمود کے دربار میں حاضر ہوئے۔ سب لوگ خوش تھے کہ آج ہماری چالوں سے ایاز بھرے دربار میں ذلیل وخوار ہوجائے گا اور ہم اسے نہ صرف دربار سے بلکہ بادشاہ کی ملازمت اور خدمت سے بھی نکال باہر کرادیں گے۔ بادشاہ نے درباریوں کے علاوہ بھی بہت سے امیروں اور ملک کے معتزز لوگوں کو اس موقع پر بلاوا بھیجا تھا کہ آج وہ دربار کی اس عجیب وغریب کاروائی کو دیکھیں، لطف لیں اور خود ہی اس بات کا بھی فیصلہ کریں کہ ہم جو ایاز کو اپنے سارے درباریوں سے زیادہ چاہتے ہیں تو آخر وہ صحیح ہے یا غلط۔

جب سارے درباری آچکے اور دربار عام کا وسیع خوبصورت ہال

اسی درمیان بادشاہ نے دربار میں گرج کر کہا کہ ہمارے حکم پر فوراً عمل ہو اور سارے گلاس فرش پر توڑ دیے جائیں۔ درباریوں نے سہم کر جلدی جلدی اپنے گلاس فرش پر دے مارے۔ سارا دربار چھن چھن کی آواز سے گونج اٹھا اور رنگ برنگی روشنیوں سے جگمگا گیا۔ کانچ کے ٹکڑوں سے اتنی زیادہ چمک ہوئی کہ سارا دربار روشنی میں نہا گیا۔ ایاز سمیت سارے درباریوں، امیروں اور مہمانوں نے اپنے جام توڑ ڈالے تھے۔ لیکن ابھی ان سب کے ہاتھ نیچے آئے ہی نہیں تھے کہ بادشاہ کا پارہ ایک دم گرم ہوگیا۔ غصے کے مارے اس کی آنکھیں شعلے برسانے لگیں۔ وہ نہایت غضب ناک ہوکر دہاڑا، ''تم لوگوں نے یہ کیا کیا؟ سرکاری خزانے کا اتنا بڑا نقصان کرڈالا۔'' اس نے طیش میں

آ کر حکم دیا: ''سب کھڑے ہوجائیں اور ایک ایک کر کے میرے پاس آ کر میرے سوال کا جواب دیں۔''

اس کے بعد بادشاہ کے حکم پر ہر درباری بادشاہ کے پاس ہاتھ باندھے اور نظریں نیچی کیے ہوئے آتا اور بادشاہ اس سے سوال کرتا کہ تم نے یہ گلاس کیوں توڑا؟ اس طرح سارے ہی لوگوں سے یہ سوال کیا گیا، اور سب کا صرف ایک ہی جواب ہوتا کہ ہم آپ کے حکم کی خلاف ورزی کیسے کر سکتے تھے؟ آپ نے حکم دیا اور ہم نے گلاس توڑ دیا۔ بلکہ ہم اگر گلاس نہ توڑتے تو آپ ہم سے اور زیادہ خفا ہوتے۔ آپ نے جو حکم دیا تھا ہم نے اسی حکم کو سر آنکھوں پر بجالانے کو اپنی خوش قسمتی سمجھا، اب رہا سرکاری خزانے کو لوٹانے کا سوال تو آپ جیسا حکم دیں گے ہم اس نقصان کا تاوان اور بدلہ دینے کے لیے تیار ہیں۔ ہم سے جو نقصان ہوا ہے ہم اس کو ضرور پورا کریں گے اور سرکاری خزانے اور مال کا نقصان نہ ہونے دیں گے۔

ایک ایک کر کے سارے درباری بادشاہ کے پاس آ چکے اور سب نے ایک ہی طرح کا جواب دیا۔ لیکن سب سے آخر میں جو شخص بچ گیا اس کا نام تھا ایاز! بادشاہ محمود کا سب سے چہیتا غلام ایاز!

بادشاہ کے دائیں طرف کھڑے خدمت گار نے آواز لگائی کہ اب ملک ایاز بادشاہ کے روبرو حاضر ہوں اور معقول عذر پیش کریں کہ انھوں نے بادشاہ کا حکم مانتے ہوئے سرکاری خزانے کا اتنا بڑا نقصان کیوں کیا؟ ایاز کا نام سنتے ہی سارے درباری سانس روکے اس کے جواب کا انتظار کرنے لگے کہ دیکھیں بادشاہ کا یہ چہیتا غلام آخر کیا جواب دیتا ہے۔ بہت سے لوگ اس بات سے بھی خوش تھے کہ آج بس ایاز کی بادشاہ کے دربار سے ہمیشہ کے لئے چھٹی ہونے والی ہے۔

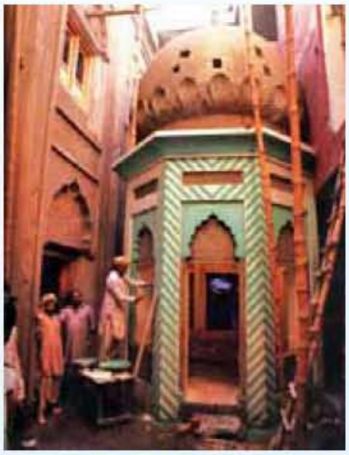

▲ لاہور پاکستان میں ایاز کا مقبرہ

اپنا نام سن کر ایاز بھی ہاتھ باندھے بادشاہ کے روبرو حاضر ہوا۔ بادشاہ نے اس سے بھی وہی سوال کیا جو اَب تک دربار کے سارے لوگوں سے کر چکا تھا۔ سب ایاز کا جواب اور بادشاہ کے عتاب کے بارے میں سننے کے لیے بے چین اور بے صبر تھے۔

لیکن اس نے جو جواب دیا اسے سن کر سارے لوگ حیرت زدہ ہو گئے۔ ایاز کہہ رہا تھا ''میرے آقا اگر چہ جام توڑنے کا آپ نے ہی حکم دیا تھا لیکن دراصل یہ میری ہی غلطی تھی کہ میں نے جام توڑ دیا۔''

یہ جواب سن کر بادشاہ نے کھڑے ہو کر ایاز کو اپنے سینے سے لگا لیا اور بھرے دربار کو مخاطب کرتے ہوئے کہا ''لوگو! اگر چہ جام کو توڑنے کا میں نے ہی حکم دیا تھا اور تم لوگوں نے بھی اپنے اپنے جواب میں یہی کہا کہ حضور آپ کے حکم کے مطابق ہی ہم نے یہ عمل کیا۔ لیکن میرے پیارے درباریو! تم دیکھ لو کہ ایاز نے صرف یہ کہا کہ سرکار! مجھ سے غلطی ہو گئی کہ میں نے جام توڑ دیا۔ اس لیے سن لو کہ ایاز سے مجھے اسی لیے محبت ہے کہ وہ اپنی جان سے بھی زیادہ مجھ سے محبت کرتا ہے اور اس کی انکساری نے ہی اسے اس اعلیٰ مقام تک پہنچا دیا۔'' □

Dr Mohd Athaer Masood Khan
Ghaus Manzil Talab Mohalla Iram , Rampur- 244901 UP

کہانی

صدر عالم گوہر

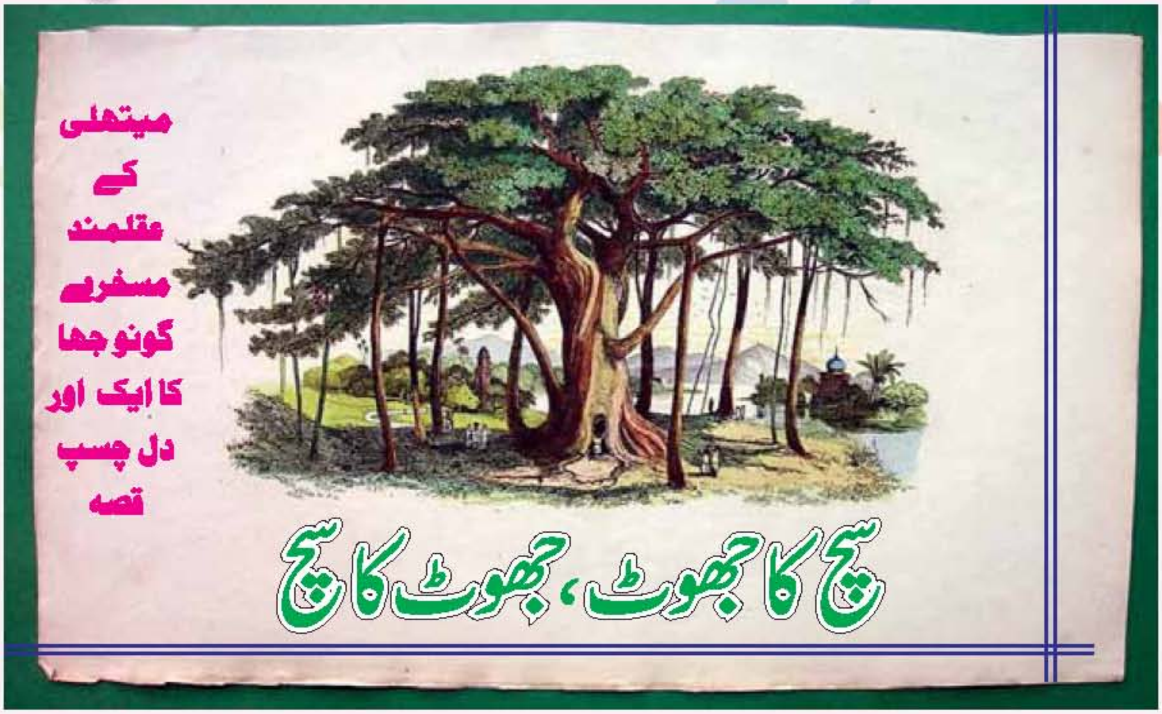

سچ کا جھوٹ، جھوٹ کا سچ

گونوجھا کی ایک کمہار سے دوستی تھی۔ جس کا نام تھا رام لال۔ دونوں کی دوستی بڑی گہری تھی۔ بلکہ یوں سمجھ لیجیے کہ دونوں لنگوٹیا یار تھے۔ دونوں میں بے تکلفی بھی تھی اور ایک ہی گاؤں کے ہونے کی وجہ سے روزانہ ملاقات ہوتی رہتی تھی۔ گونو جھا کی عقلمندی اور چالاکی کے

قصے جب دور دور تک مشہور تھے تو بھلا گونو جھا کا لنگوٹیا یار کیسے اس سے نا واقف رہتا۔ اس نے بھی گونو جھا کے طرح طرح کے قصے سنے تھے۔ اور وہ چاہتا تھا کہ کبھی گونو جھا سے اس کی عقلمندی کا حال سنتا اور دیکھتا۔ وہ چاہتا تھا کہ گونو جھا اپنی چالاکی ہوشیاری اور عقلمندی کیسے استعمال میں لاتا ہے وہ اسے بھی دکھائے۔ رام لال کمہار بار بار گونو جھا سے کہتا کہ گونو جھا آپ مجھے بھی کسی دن دکھایئے کہ آپ سچ کو جھوٹ اور جھوٹ کو سچ کیسے بناتے ہیں۔ گونو جھا ٹال دیتے کہ چھوڑیے کبھی موقع ملا تو یہ بھی دکھا دیں گے۔ موقع تو آنے دیجیے۔ یہی سلسلہ کچھ دنوں تک چلتا رہا۔ رام لال کمہار بار بار کہتا اور گونو جھا کسی دوسرے دن پر ٹال دیتے ۔ایک دن رام لال کمہار ضد پر اڑ گیا کہ یار مجھے اپنی کرامات دکھاؤ۔ گونو جھا نے کہا ”دوست جلد ہی ہم آپ کو اپنی چالاکی عقلمندی اور ہوشیاری کا ایک نمونہ دکھا دیں گے۔ آپ بے فکر رہیے۔“

اتفاق سے دوسرے دن گونو جھا کا سامنا اپنے دوست رام لال کمہار سے ہوا تو گونو جھا نے کہا، ”ارے یار آپ ہمارے دوست ہیں

ایک کام ہمارا کر دیجیے بڑا احسان ہوگا۔"

رام لال کمہار نے کہا، "ارے دوست کیا بات کرتے ہیں۔ آپ کا ایک کام تو کیا ایک ہزار کام کر دوں گا۔ آپ کا جگری دوست ہوں۔ دوست ہی تو دوست کے کام آتا ہے۔ آپ حکم تو کیجیے میں بھلا کس دن کام آؤں گا۔ آپ نے آج تک مجھ سے کوئی کام کرنے کو ہی نہیں کہا۔ اب کہا ہے تو میں حاضر ہوں۔ آپ حکم کریں، کیا کام ہے۔ کون ایسا ضروری کام پڑ گیا ہے۔"

گونو جھا نے کہا، "دوست کام کوئی بڑا نہیں ہے، ایک بہت ہی چھوٹا سا کام ہے۔ آپ کے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔ آپ چاہیں تو ذرا سی دیر میں کر سکتے ہیں۔ آپ کے ہی پیشہ سے جڑا ہوا ہے۔ میں کوئی آپ کو ایسے کام کے لیے نہیں کہوں گا جو آپ کے بس کا نہ ہو۔ نہ یہ آسمان سے چاند ستارے توڑ لانے کی بات ہے، نہ سمندر کی تہہ سے موتی نکالنے جیسی۔ میں تو ایک بہت ہی چھوٹا سا کام آپ سے کہتا ہوں۔ جو آپ کی روز کی زندگی کا حصہ ہے اور جو آپ دن رات کرتے ہیں۔"

رام لال کمہار نے کہا، "پہیلیاں مت بجھایئے گونو جھا، صاف صاف کہیے اور حکم دیجیے، میری بے چینی بڑھتی ہی جا رہی ہے کہ آپ کون سا کام کروانا چاہتے ہیں۔"

گونو جھا نے کہا، "دوست، آپ مجھے مٹی کے سوسکے بنا کر دیجیے مٹی کے برتن، گھڑا، لوٹا، صراحی اور نہ جانے کیا کیا آپ روز گڑھتے ہی رہتے ہیں۔ اس کام میں آپ ماہر بھی ہیں۔ مٹی کے سوسکے بنانا آپ کے لیے کیا مشکل ہے۔"

رام لال کمہار نے کہا، "گونو جھا آپ نے جو کام کہا وہ دیکھنے میں تو بڑا نہیں۔ لیکن سوچا جائے تو یہ ہمارے لیے بہت بڑا اور مشکل کام ہے۔ گھڑا، صراحی وغیرہ بنانا یا کوئی بڑی چیز بنانا تو کوئی مشکل کام نہیں ہے۔ مگر سکہ بنانا مشکل کام ہے کیونکہ وہ بہت چھوٹے ہوتے ہیں۔ اس میں بڑی کاریگری کی ضرورت ہوگی کیونکہ سکے میں نقش و نگار ہوتے ہیں جن کو بڑی ہنر مندی سے بنانا ہوگا اور اس میں وقت بھی لگے گا، محنت بھی۔ اس کام میں مہارت لانے کے لیے کچھ وقت دینا ہوگا تاکہ کسی ماہر کاریگر کی طرح اسے کر سکوں نہیں تو آپ بھی کیا کہیں گے کہ میرا دوست رام لال ہے تو کمہار، دن بھر مٹی میں کھیلتا ہے مگر مٹی سے کھیلنا نہیں آتا ہے۔ اپنے کام میں کچا ہے۔ آپ چالاکی، ہوشیاری اور عقلمندی میں ماہر ہیں تو میں مٹی کے کام میں ماہر ہوں مٹی کو جس سانچے میں چاہوں ڈھال سکتا ہوں۔ میں تو اس کام میں اتنا ماہر ہوں کہ چاہوں تو مٹی کا ایک گونو جھا بنا دوں۔ اور وہ بھی ایسا کہ آپ کو اور اپنے مٹی کے گونو جھا کو ایک جگہ کھڑا کر دوں تو لوگ مٹی کے گونو جھا کو اصلی گونو جھا سمجھیں گے۔"

گونو جھا نے کہا، "واہ دوست آپ اپنے کام میں اتنے ماہر ہیں یہ تو مجھے معلوم ہی نہیں تھا۔ چلیے آپ مجھے پہلے مٹی کے سوسکے بنا کر دیجیے تو میں سمجھوں کہ آپ کتنے ماہر ہیں۔"

رام لال کمہار نے کہا، "ٹھیک ہے۔ دو تین دن ٹھہر جایئے۔

ابھی کام کچھ زیادہ آگیا ہے میرے پاس۔ اسے ختم کر کے میں آپ کا کام شروع کر دیتا ہوں۔ اور جلد از جلد سکّے بنا کر دیتا ہوں۔"

دو چار دن کے بعد رام لال کمہار آیا اور کہا، "لیجیے دوست پچاس سکّے میں لایا ہوں انھیں رکھیے، باقی پچاس سکّے بعد میں دوں گا۔"

گونو جھا نے کہا، "دوست آپ بالکل سیدھے سادے ہیں۔ سکّے ایسے نہیں دیے جاتے جیسے آپ دے رہے ہیں۔ سکّوں کو مخمل کے لال بٹوے میں دیا جاتا ہے۔ آپ انھیں مخمل کے لال بٹوے میں لا کر دیجیے تو میں آپ کے اعلیٰ ذوق کی داد دوں۔"

رام لال کمہار چلا گیا اور دوسرے دن مخمل کے لال بٹوے میں پچاس سکّے لا کر گونو جھا کو دے دیے۔

گونو جھا نے کہا، "یہ ہوئی نہ بات۔ اب لگ رہا ہے کہ آپ نے سکّے شان کے مطابق پیش کیے ہیں۔ میری بھی طبیعت کھل گئی، دل خوش ہو گیا۔ مگر یہ تو صرف پچاس سکّے ہیں باقی کے پچاس؟"

رام لال کمہار نے کہا، "فی الحال تو پچاس سکّے ہی تیار ہوئے ہیں۔ آپ انھیں رکھیے، کچھ دنوں میں باقی کے پچاس سکّے بھی دے دوں گا۔"

اس واقعے کو کچھ دن گزر گئے۔ ایک بار ایک جگہ کچھ لوگ جمع تھے آپس میں کچھ باتیں ہو رہی تھیں۔ گونو جھا بھی وہاں تھے۔ کہ اتنے میں دیکھا ان کا دوست رام لال کمہار اسی طرف آ رہا تھا۔

گونو جھا نے کمہار کو روکا اور کہا، "دوست پچاس سکّے جو آپ کے یہاں باقی رہ گئے وہ آپ نے دیے ہی نہیں۔"

رام لال کمہانے کہا، "دوست کچھ دن کی اور مہلت دیجیے میں باقی کے پچاس سکّے ضرور دے دوں گا۔"

ایک دن ایک تالاب کے کنارے کچھ لوگ پیپل کی چھاؤں میں بیٹھے تھے۔ گرمی کا موسم تھا گاؤں میں کہیں سکون نہیں تھا۔ دھوپ تیز تھی اور ہوا چل نہیں رہی تھی۔ اس لیے لوگ ایک پیپل کے پیڑ کے نیچے گھنی چھاؤں میں بیٹھے تھے جہاں تالاب کے پانی کی وجہ سے ہوا بھی ٹھنڈی ٹھنڈی چل رہی تھی۔ لوگوں کو دھوپ سے آرام مل رہا تھا۔ گونو جھا بھی وہاں آگئے اور دل میں کہنے لگے اچھی جگہ ہے سارا گاؤں یہاں جمع ہے۔ یہاں کچھ سکون ہے اور گرمی سے راحت مل بھی رہی ہے۔ چلیے کچھ دیر اس پیپل کی چھاؤں میں بیٹھا جائے۔ اتنے میں دیکھا گونو جھا کا دوست رام لال کمہار آ رہا ہے۔ جب وہ پیپل کی چھاؤں میں پہنچا تو گونو جھا نے کہا، "دوست آپ نے مجھے باقی کے پچاس سکّے نہیں دیے اب اور کتنے دن صبر کروں۔"

رام لال کمہار نے کہا "دوست آپ تو بے صبر ہوئے جا رہے ہیں۔ میری بات کا یقین نہیں ہے۔ میں نے کہا نا، باقی کے پچاس سکّے جلد از جلد دے دوں گا۔"

پھر کسی دوسرے موضوع پر گفتگو ہونے لگی۔ کچھ دن اور گزرے۔ ایک دن دشرتھ کے بیٹے کی شادی تھی۔ اس موقعے پر سارے گاؤں کو دعوت دی گئی تھی۔ سارا گاؤں جمع تھا۔ دعوت کی تیاری مکمل ہو چکی تھی۔ پوری، جلیبی اور دہی وغیرہ کا انتظام تھا۔ کافی لوگ آ چکے تھے۔ گونو جھا کا کمہار دوست بھی آگیا۔ گونو جھا نے رام لال کمہار کو دیکھتے ہی کہا دوست میرے پچاس سکّے جو باقی تھے آپ نے اب تک نہیں دیے۔ کیا دینے کا ارادہ نہیں ہے؟"

کمہار نے کہا، "دوست آپ کچھ دن اور صبر کیجیے میں آپ کے باقی کے سکّے ضرور دے دوں گا گھبرائیے نہیں۔"

پھر ایک دن ایسا ہوا کہ گونو جھا نے پنچایت بلا لی۔ اس پنچایت میں گونو جھا کے دوست رام لال کمہار کو بلایا گیا۔ گونو جھا نے پنچوں سے کہا، "دیکھیے پنچ پرمیشور، میں نے اپنے کمہار دوست کو سونے کے سو سکّے دیے تھے، پچاس سکّے تو انھوں نے واپس دے دیے باقی پچاس

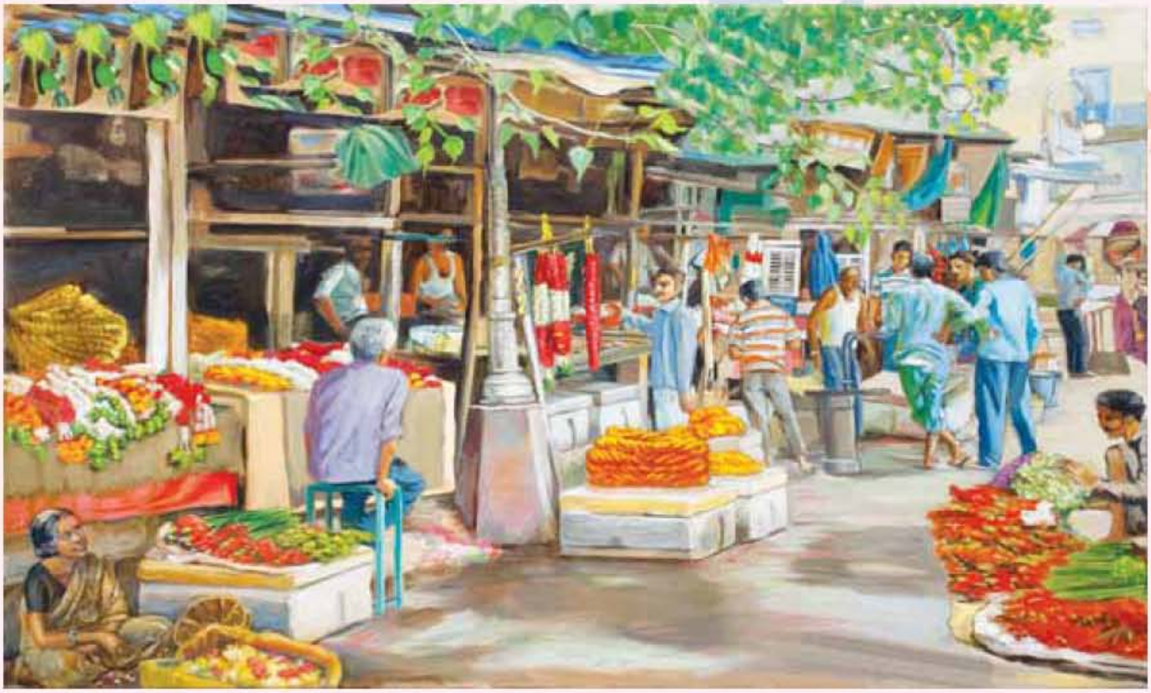

سکے بعد میں دینے کا وعدہ کیا۔ یہ ہمیں مہینوں سے ٹال رہے ہیں۔ لگتا ہے ان کے دل میں بے ایمانی آ گئی ہے، یہ مجھے باقی کے پچاس سکے شاید نہیں دینا چاہتے ہیں۔ اب آپ پنچ لوگ ہی میرا انصاف کر دیں میرے پچاس سونے کے سکے دلوا دیں۔"

کمہار حیرت میں پڑ گیا کہ یار یہ کیا ماجرا ہوا؟ میں نے کب گونو جھا سے سو سکے لیے، اور پچاس سونے کے سکے کب دے دیے۔ گونو جھا تو سراسر جھوٹ بول رہا ہے۔ یہ تو مجھے مروا ڈالے گا۔

کمہار نے کہا، "گونو جھا آپ کیا مذاق کر رہے ہیں؟ پورے گاؤں کو جمع کر کے تماشہ کھڑا کرنا چاہتے ہیں۔ یہ سب بالکل جھوٹ ہے۔ میں نے کب آپ سے سونے کے سو سکے لیے۔ یہ جھوٹ ہے، غلط الزام ہے۔ میں نے کبھی آپ سے سونے کے سو سکے نہیں لیے۔ یہ کیا فضول بکواس کر رہے ہیں آپ؟"

گونو جھا نے کہا "میں مذاق نہیں کر رہا ہوں۔ اگر آپ کو میں نے نہیں دیے ہوتے تو بھلا آپ سے کیوں مانگتا؟ کیا مجھے پاگل کتے نے کاٹا ہے جو میں اول فول بکتا۔ آپ کی نیت میں کھوٹ ہے، لینے کے وقت چپ رہے۔ اب دیتے وقت سب کے سامنے شور مچا رہے ہیں۔ اگر جس طرح آپ نے چپکے سے لیے تھے اسی طرح چپکے سے لوٹا دیتے، تو یہ تماشہ کھڑا نہ ہوتا۔ بلکہ تماشہ تو آپ کھڑا کر رہے ہیں میں نہیں۔ آپ سیدھے سے میرے پچاس سونے کے سکے دے دیں۔ میں اور کچھ نہیں جانتا۔"

کمہار نے پنچوں سے کہا، "پنچ لوگ سن لیجیے۔ گونو جھا جھوٹ بول رہے ہیں۔ میں نے ان سے کبھی قرض نہیں لیا۔"

گونو جھا نے کہا، "پنچ پرمیشور انھوں نے پچاس سونے کے سکے اس لال بٹوے میں لوٹائے تھے۔ پوچھئے میرے عزیز دوست رام لال کمہار سے کہ یہ لال مخملی بٹوا ان کا ہے یا نہیں۔"

گونو جھا نے لال مخملی بٹوا پنچوں کو دکھا دیا۔

پنچوں نے رام لال کمہار سے کہا، "رام لال بھائی کیا یہ بٹوا آپ ہی کا ہے؟"

رام لال کمہار نے کہا،" بیشک یہ بٹوا میرا ہی ہے۔ مگر میں نے اس میں مٹی کے پچاس سکّے گونو جھا کو دیے تھے۔"

گونو جھا نے کہا،" دیکھیے پنچ پرمیشور، کمہار دوست یہ تو قبول کر رہے ہیں کہ یہ لال مخملی بٹوہ اِن کا ہے۔ مگر یہ نہیں قبول کر رہے ہیں کہ پچاس سونے کے سکّے دیئے تھے۔ اب ذرا آپ ہی سوچئے مٹّی کے سکّے لے کر میں بھلا کیا کروں گا۔ اور مٹّی کے سکّے کہیں سونے کے مخملی بٹوے میں لیے دیے جاتے ہیں۔ جب بٹوہ اِن کا ہے یہ ثابت ہو گیا تو اب سونے کے سکّے سے مکر رہے ہیں۔ میرے پاس ثبوت موجود ہے میں گواہی دلا سکتا ہوں۔ میرے ایک دو گواہ نہیں بلکہ کئی درجن گواہ ہیں۔ جو یہ جانتے ہیں کہ میرے پچاس سونے کے سکّے ان کی طرف نکلتے ہیں۔"

پھر جن جن لوگوں کے سامنے گونو جھا نے کمہار سے سکّوں کا تقاضا کیا تھا ان سب کو بلایا گیا اور سب سے پوچھا گیا تو سبھوں نے گواہی دی کہ گونو جھا سچ کہہ رہے ہیں اور انھوں نے رام لال کمہار سے ان کے سامنے تقاضہ کیا تھا کہ میرے پچاس سکّے کب دو گے، تو رام لال کمہار نے کہا تھا تھوڑا صبر کیجیے میں کچھ دنوں میں دے دوں گا۔

یہ سب سن کر پنچوں نے فیصلہ کیا کہ گونو جھا سہی کہہ رہے ہیں۔ سارے گواہ موجود ہیں۔ پچاس سونے کے سکّے جس بٹوے میں دیے تھے وہ بٹوہ بھی موجود ہے اور رام لال کمہار بھی یہ قبول کر رہا ہے کہ بٹوہ اسی نے دیا تھا، اس سے ثابت ہوتا ہے کہ گونو جھا سچ بول رہے ہیں۔ رام لال کمہار کی طرف گونو جھا کے سونے کے پچاس سکّے باقی ہیں۔ اس لیے پنچوں کا یہ فیصلہ ہے کہ رام لال کمہار ابھی سونے کے پچاس سکّے لا کر گونو جھا کو دے۔ رام لال کمہار کی ایک نہیں سنی گئی۔ اور آخر میں مجبور ہو کر رام لال کمہار کو سونے کے پچاس سکّے پنچوں کے سامنے گونو جھا کو لا کر دینے پڑے اور ان سے خفا ہو کر وہ غصہ سے لال پیلے ہوتے ہوئے اپنے گھر چلے گئے۔

اس کے بعد سے رام لال کمہار نے گونو جھا سے ہر رشتہ توڑ لیا۔ دعا سلام خیریت تو دور کی بات گونو جھا سے بول چال بھی بند کر دی۔ کبھی راستے میں ٹکرا جاتے تو منھ بچکا کر رام لال راستہ بدل دیتے۔ اب تک جو لنگوٹیا یار تھے وہ دشمن کی طرح برتاؤ کرنے لگے اور ایسا لگتا تھا کہ ان کا بس چلتا تو گونو جھا کو کچا چبا جاتے۔

ایک دن گونو جھا ان پنچوں کو ساتھ لے کر گونو جھا رام لال کمہار کے گھر پہنچے جن کے سامنے اسے بے عزت کیا تھا اور ان سے سونے کے پچاس سکّے لیے تھے۔ انھوں نے رام لال کو گھر سے باہر بلایا۔ رام لال کمہار کا تو پارہ چڑھ گیا۔ غصّے سے لال پیلے ہوتے ہوئے کہا "اب کیا باقی رہ گیا۔ اب کیا میرا گھر بار لکھوانے آئے ہیں۔"

گونو جھا نے کہا،" دوست اتنے خفا مت ہوئیے۔ میں آپ کا دشمن نہیں دوست ہوں۔ میں آپ کا برا نہیں چاہتا۔ میں نے ہمیشہ

آپ کا بھلا چاہا ہے۔اور چاہتا رہوں گا۔"

رام لال کمہار آپے سے باہر ہو رہے تھے۔ بولے،"میں خوب جانتا ہوں۔آپ میرے کیسے خیر خواہ ہیں ۔ کتنی محبت ہے آپ کو ہم سے۔آپ مجھے اپنا دوست نہ کہیں تو بہتر ہوگا۔دشمن بھی آپ سے اچھا ہوگا۔نہ جانے کس جنم کا بدلہ آپ نے مجھ سے لیا ہے۔"

گونو جھا نے کہا،"دوست غصّہ تھوک دیجیے۔ذرا مجھے کہنے تو دیجیے میں کیا کہنا چاہتا ہوں اور ان پنچوں کو لے کر یہاں کیوں آیا ہوں۔ بات دراصل یہ ہے کہ میں آپ کے سونے کے پچاس سکّے آپ کے مخملی لال بٹوے کے ساتھ لوٹانے آیا ہوں ۔آپ بار بار مجھ سے کہتے تھے نہ کہ سچ کو جھوٹ اور جھوٹ کو سچ کیسے بناتے ہیں؟ اور میں کئی بار آپ کو یہ کہہ کر ٹال چکا تھا کہ کبھی موقع آنے پر بتا دوں گا۔ میں نے اسی کو ثابت کرنے کے لیے اتنا بڑا ناٹک کیا تھا۔اب تو آپ سمجھ گئے ہوں گے جھوٹ کو سچ اور سچ کو جھوٹ کیسے بنایا جاتا ہے۔یہ لیجیے آپ کے سونے کے پچاس سکّے۔آپ کو نقصان پہنچانا ہرگز میرا مقصد نہیں تھا۔"

اتنا سنتے ہی رام لال کمہار کا چہرہ کھل اٹھا۔ان کا سارا غصّہ ہوا ہو گیا اور گونو جھا کو گلے لگا کر بولے،"یار اب میں آپ کو کسی بھی عقلمندی یا ہوشیاری کا نمونہ دکھانے کے لیے نہیں کہوں گا۔اب آپ میرے اور گہرے دوست ہو گئے۔ میں سمجھ گیا کہ سچ کو جھوٹ اور جھوٹ کو سچ کیسے بنایا جاتا ہے۔" □

Mr Sadre Aalam Gauhar Post Parsolia via Jai Nagar Distt
Madhubani -847226 Bihar

محمد امان اللہ

کاغذ کا ٹکڑا

پرائیویٹ جاسوس دلشاد ان دنوں گرمیوں کی چھٹیوں میں اپنے گاؤں حسن پور گیا ہوا تھا۔ حسن پور ایک سرسبز و شاداب گاؤں تھا جہاں لہلہاتے کھیت تھے، ہری ہری وادیاں تھیں اور خوبصورت معصوم لوگ رہتے تھے۔ دلشاد اپنے گھر میں بیوی بچوں اور اپنی بوڑھی ماں کے ساتھ رہتا تھا۔ گاؤں میں چونکہ کام نہیں تھا اس لیے وہ روزانہ شام میں چہل قدمی کرنے ضیا گنج تک جاتا تھا جہاں ڈھابے اور ہوٹل اور روزمرہ کے کام کاج کے سامان کی دوکانیں تھیں۔ ایک شام دلشاد 'صادق ڈھابے' کے سامنے سے گذر رہا تھا کہ اسے ایک شخص چیختا چلّاتا نظر آیا۔ اس نے قریب جا کر پوچھا کہ بھائی کیوں گلا پھاڑ رہے ہو۔ وہ شخص ہاتھ اٹھا اٹھا کر کہہ رہا تھا۔

''مل جائے وہ بدمعاش تو اسے مزا چکھاتا ہوں۔''

دلشاد نے اس سے پوچھا۔ ''کس بدمعاش کی بات کر رہے ہو؟ کون مل جائے اور کسے مزا چکھاؤ گے؟''

دلشاد کے پوچھنے پر اس شخص نے اپنا نام کوثر بتایا اور کہا کہ میں یہاں سے گذر رہا تھا تو ایک داڑھی والے نے مجھے روک کر کہا کہ اگر میں اس کا ایک کام کر دوں تو وہ مجھے 100 روپے دے گا۔ میں نے پوچھا کہ مجھے کیا کرنا ہے۔ اس نے مجھے ایک کاغذ کا تین کونوں پر مڑا ہوا ٹکڑا دیا اور بولا کہ اسے صادق ڈھابے کے کاؤنٹر پر بیٹھے شخص کو دے دو۔ وہ ایک نیلا تھا اور اس پر کچھ بھی نہیں لکھا تھا۔ مجھے تعجب ہوا لیکن 100 روپیوں کی لالچ میں میں نے وہ کاغذ لے لیا اور صادق ڈھابے میں جا کر وہاں ریسپشن پر بیٹھے آدمی کو کاغذ دے دیا۔ اس آدمی نے کاغذ کو الٹ پلٹ کر دیکھا اور مجھے ڈانٹ کر بھگا دیا۔ جب میں واپس آیا تو وہ شخص غائب تھا۔ مجھے 100 روپے بھی نہیں ملے اور ڈانٹ بھی کھانی پڑی۔''

عقل مند جاسوس دلشاد نے ایک نظر میں ہی اندازہ لگا لیا کہ یہ کاغذ کوئی بہت خاص معنی رکھتا ہے، اس لیے اس نے کوثر سے کہا کہ آپ مجھے یہ کاغذ دے دیں اور 100 روپے لے لیں۔ اس نے خوشی خوشی وہ کاغذ دلشاد کے حوالے کر دیا۔

تکونے کاغذ کو لے کر دلشاد نے غور سے دیکھا تو وہ واقعی بالکل سادہ کاغذ تھا۔ اس نے کاغذ کو جیب میں رکھا اور گھر واپس آ گیا۔ گھر میں اس نے محدب شیشے Magnifying Glass کی مدد سے دیکھنے کی کوشش

کی کہ کچھ نظر آجائے لیکن اسے ناامیدی ہی ہاتھ لگی۔ دوسری شام وہ کاغذ جیب میں لے کر نکلا اور صادق ڈھابے پر پہنچ گیا۔ اس نے کاؤنٹر پر بیٹھے آدمی کو کاغذ دکھایا۔ اس نے کاغذ ہاتھ میں لے کر دیکھا اور سوالیہ انداز میں دلشاد کو دیکھنے لگا۔

دلشاد نے اسے پوری بات تفصیل سے بتائی اور یہ بھی کہا کہ وہ ایک جاسوس ہے۔ یہ سنتے ہی وہ شخص گھبرا گیا۔ اس نے کہا ”کاؤنٹر پر جو بیٹھتا ہے اس کا نام مشکور نام ہے۔ مگر آج سے ہی وہ چھٹی پر چلا گیا ہے اور پتہ نہیں اب کب آئے گا۔“

دلشاد نے اس سے چھٹی کی وجہ پوچھی تو وہ کہنے لگا ”کل کسی آدمی نے مشکور کو یہ کاغذ دیا تھا جس کے بعد وہ کافی گھبرا گیا اور کل رات ہی چھٹی لے کر چلا گیا۔“

دلشاد کو اب اس کیس میں دلچسپی پیدا ہونے لگی تھی۔ اس نے مشکور کا پتہ پوچھا اور اس کے گھر پہنچ گیا۔ گھر پر مشکور کی بیوی ملی جس نے کہا کہ وہ آج صبح سے ہی دوسرے گاؤں گئے ہوئے ہیں۔ وہ بھی دلشاد کو اپنے دروازے پر دیکھ کر کافی پریشان ہوگئی تھی کہ ایک جاسوس اس کے شوہر کو ڈھونڈھنے کیوں آیا ہے۔ اس نے دلشاد سے پوچھا کہ کیا معاملہ ہے؟

دلشاد نے بتایا ”کچھ خاص نہیں بس تھوڑی پوچھ تاچھ کرنی ہے۔“

پھر دلشاد نے اسے پوری بات بتائی تو وہ گھبرا گئی۔ اس نے کہا ”میں آپ کے ساتھ ہی چلتی ہوں۔ مجھے پتہ ہے وہ کہاں گئے ہیں۔“

دلشاد اور مشکور کی بیوی دوسرے گاؤں جانے کے لیے نکل کھڑے ہوئے، جہاں مشکور اپنے ایک قریبی دوست کے یہاں گیا ہوا تھا۔ جب وہ دونوں وہاں پہنچے اور مشکور کی بیوی نے دلشاد کا تعارف مشکور سے کرایا اور ایک نیلے کاغذ کا تذکرہ کیا تو اس کے چہرے پر ہوائیاں اڑنے لگیں۔ اس کا گھبرایا ہوا چہرہ دیکھ کر دلشاد نے اسے تسلی دی اور کہا ”گھبرانے کی کوئی بات نہیں، مجھے سچ سچ بتاؤ کہ اس تکونے سفید کاغذ کی کیا کہانی ہے؟“

مشکور پہلے تو اِدھر اُدھر کی باتوں میں ٹالتا رہا لیکن دلشاد کے سختی کرنے پر اس نے بتانا شروع کیا:

"یہ تکونا نیلا کاغذ ہم تین دوستوں کی پہچان ہے۔ دراصل ہم تینوں دوست کسی زمانے میں جرم کی دنیا کے بادشاہ تھے۔ ہم نے بہت بڑا ڈاکہ ڈالا تھا جس کے بعد ہمارے دونوں دوست جن کے نام شہزاد اور امروز تھے لاپتہ ہوگئے تھے۔ بہت دنوں کے بعد مجھے معلوم ہوا کہ امروز جیل چلا گیا ہے تو میں نے شہزاد کو تلاش کیا اور اس کو ساتھ لے کر امروز سے ملنے جیل گیا جہاں ہم نے طے کیا کہ سارا معاملہ ختم ہو جانے پر ہم اپنا حلیہ بدل لیں گے اور نئے سرے سے زندگی شروع کریں گے۔ یہ کاغذ ایک دوسرے کو اسی طرح موڑ کر دے دیا کہ جب بھی ہم ملیں گے یہ کاغذ دکھائیں گے اور یوں ایک دوسرے کو پہچان لیں گے۔ اس کے بعد ہم دونوں بھی الگ ہوگئے۔ تب سے ہمیں ایک دوسرے کی کوئی خبر نہیں۔ آج اتنے برسوں بعد اچانک یہ کاغذ میرے سامنے آیا تو میں گھبرا گیا، کیوں کہ اب میں بیوی بچوں والا ہوں اور جرم کی دنیا سے رشتہ توڑ چکا ہوں۔ مجھے نہیں پتہ میرے کس دوست نے یہ کاغذ مجھے بھجوایا ہے۔ میں کافی ڈر گیا تھا اس لیے چھٹی لے کر یہاں چلا آیا۔"

ساری تفصیل سن کر جاسوس دلشاد نے اطمینان سے سر ہلایا اور مشکور سے کہا "گھبراؤ نہیں میں تمہارے ساتھ ہوں۔"

اس کے بعد کچھ دیر تک وہ سوچتا رہا اور بولا "ہم ایک کام کرتے ہیں۔ بھیس بدل کر صادق ڈھابے کے قریب پہرے داری کریں گے۔ دیکھتے ہیں کیا نتیجہ نکلتا ہے۔"

مشکور دلشاد کی بات مان گیا اور دوسرے دن سے دونوں نے شکلیں تبدیل کر کے صادق ڈھابے کے آس پاس منڈلانا شروع کردیا۔ دو تین دن کے بعد اچانک صادق ڈھابے کے اندر جاتے ہوئے ایک شخص کو دیکھ کر مشکور نے اشارہ کیا کہ یہ داڑھی والا شخص اس کا دوست امروز ہے۔ دلشاد نے امروز کا پیچھا کرنا شروع کیا اور کچھ ہی دیر میں اسے دھر دبوچا۔ داڑھی والے کے ہاتھ آتے ہی اس سے سوالوں کی جھڑی لگادی۔

"بتا اس سفید کاغذ کا کیا معاملہ ہے؟ کیوں تو مشکور سے ملنا چاہتا ہے؟ کیا کرتا ہے؟ کہیں کوئی ڈاکہ تو نہیں ڈالنا تجھے؟"

دلشاد کے اتنے سارے سوالات سن کر وہ گھبرا گیا اور اس نے زبان کھول دی۔ اس نے بتایا کہ وہ بھی جرم کی دنیا سے توبہ کر چکا ہے اور مشکور کو اپنی شناخت کے لیے تکونا کاغذ بھجوایا تھا تا کہ پہلے یہ دیکھ لے کہ کاغذ ملنے کا اس پر کیا اثر ہوتا ہے۔ وہ خود چاہتا تھا کہ مشکور اس کی مدد کرے اور وہ بھی عزت کی زندگی جیے۔ یہ سن کر دلشاد نے مشکور کو فون کیا اور مشکور بھی وہاں پہنچ گیا۔ ساری باتیں سن کر وہ امروز کے گلے لگ گیا اور رونے لگا۔ دونوں بچھڑے ہوئے دوست آپس میں مل گئے۔ دلشاد کی آنکھوں میں بھی آنسو آگئے۔ مگر اسے خوشی تھی کہ اس کی مدد سے دو دوست مل گئے اور دونوں نے عزت کی زندگی گزارنے کا فیصلہ کیا تھا۔

اُسے اس بات کی بھی خوشی تھی کہ اس دفعہ گرمیوں کی چھٹیوں میں اُس نے ایک نیک کام انجام دیا تھا۔ □

Mr Muhammad Amanullah 337, Jehlum Hostel
JNU, New Delhi-110067

مجیب شہزر

ققنس

ققنس آگ کا کیڑا ہے   آگ کی کوکھ سے جنما ہے
آگ ہی اس کی ماتا ہے   آگ ہی اس کا بابا ہے
گود میں شعلوں کی یہ پلے   بچوں والی چال چلے
کھیلے آگ کے آنگن میں   ناچے آگ کے گلشن میں
گھبرائے جو اکیلے میں   گھومے آگ کے میلے میں
آگ ہے اس کا اپنا جہاں   آگ ہی میں ہے اس کا مکاں
آگ کا ہی یہ قلندر ہے   آگ کا ہی یہ سمندر ہے
بھوک میں آگ ہی کھاتا ہے   آگ سے پیاس بجھاتا ہے
برسوں جلتی آگ جہاں   لیتا ہے یہ جنم وہاں

جسے نہ آگ سے ہو پیڑا
وہی ہے یہ ققنس کیڑا

یونان کے قدیم قصے کہانیوں میں ایک پرندے ققنس Phoenix کا ذکر ملتا ہے جو آگ سے پیدا ہوکر موت آنے پر جل کر راکھ ہو جاتا ہے اور پھر اسی راکھ سے دوبارہ پیدا ہوتا رہتا ہے۔ یہ قصے تم بڑے ہوکر پڑھوگے۔ مگر ققنس ایک فرضی پرندہ ہے جس کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں۔ ہمارے شاعر صاحب نے اسے کیڑا ضرور بنا دیا ہے مگر کہانیوں میں یہ پرندے کے طور پر ہی ملتا ہے۔ مدیر اعزازی

Dr Mujeeb Shahzar 159/9 Tan Tan Para Kankar Wali Gali ALIGARH 202001

ظفر سعیدی

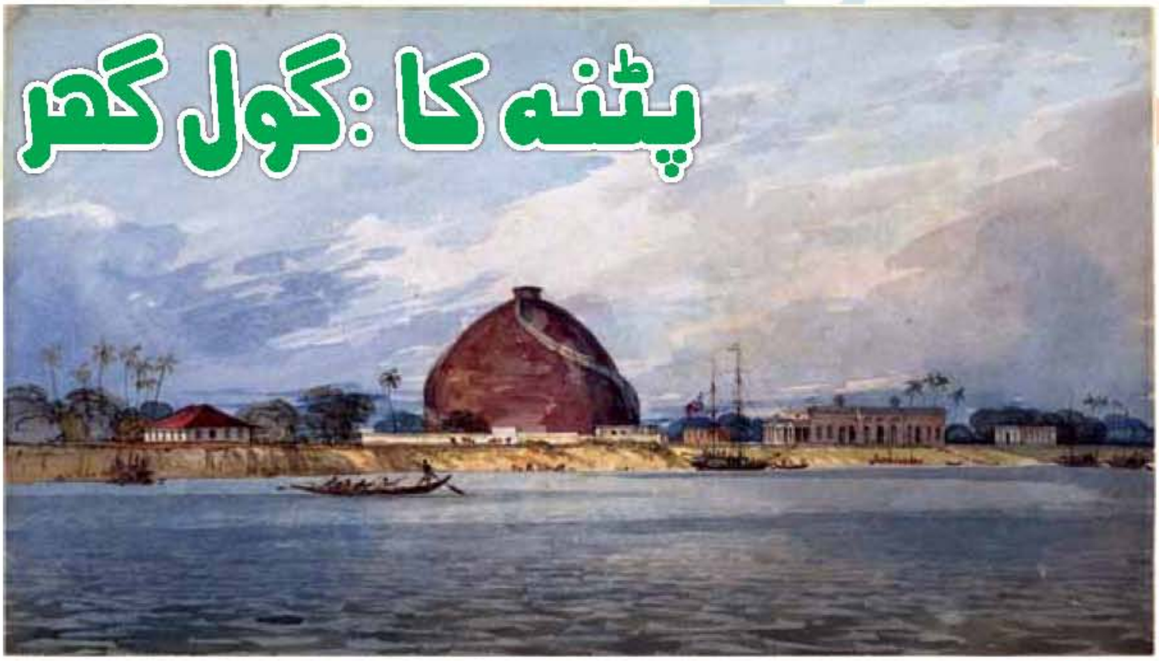

پٹنہ کا: گول گھر

چلیے آج ہم آپ کو پٹنہ کا گول گھر دکھاتے ہیں۔لیکن پہلے پٹنہ کی بات ہو جائے جو صوبۂ بہار کی وہ راجدھانی ہے۔

پٹنہ، بہار کا ایک قدیم ترین تاریخی شہر ہے۔ اشوک اعظم کے زمانے میں اس شہر کا نام پاٹلی پتر تھا اور مغلوں کے دور میں اسے عظیم آباد کہا جانے لگا تھا جو بعد میں بدل کر پٹنہ ہو گیا۔ یہاں کی پاٹلی پتر اور عظیم آباد کالونیاں ان ہی پرانے ناموں کی یاد دلاتی ہیں۔اس شہر کے نزدیک انگریزوں کے راج میں بنایا جانے والا گول گھر Round House ہے جو دراصل ایک اناج گھر یا زبردست کھلیان ہے جسے لوگ دور دور سے دیکھنے آتے ہیں۔

سینہ بہ سینہ اور تاریخی تذکروں میں بھی یہ بات چلی آتی ہے کہ 1770 میں بہار میں اور ہندوستان کے دوسرے کئی علاقوں مثلاً بنگال اور موجودہ بنگلہ دیش کے علاقوں میں جو اس وقت ہندوستان میں ہی شامل تھے زبردست قحط پڑا تھا۔بارش نہ ہونے کی وجہ سے سوکھا پڑا اور اس سے جو بھکمری پھیلی اس میں تقریباً ایک کروڑ لوگوں کی جان چلی گئی۔ اس قحط کا کئی سال تک اثر رہا۔چارے کی کمی سے ان دنوں گایوں اور بھینسوں کے تھن کے دودھ خشک ہو گئے تھے اور پتہ نہیں کتنے بھوک سے دم توڑ گئے تھے۔عوام کی خاص طور سے غریب لوگوں کی حالت بہت ہی خراب تھے۔ایسے میں انگریزوں کی ایسٹ انڈیا کمپنی کے گورنر وارین ہیسٹنگز کو انگریز فوجیوں کے کھانے کے انتظام کی فکر ہوئی اور اس نے اناج کے ذخیرے کا زبردست ذخیرہ کرنے کی ہدایت جاری کردی۔یہ کام ایک انگریز انجینئر جان گراسٹن John Garstin کو سونپا گیا۔

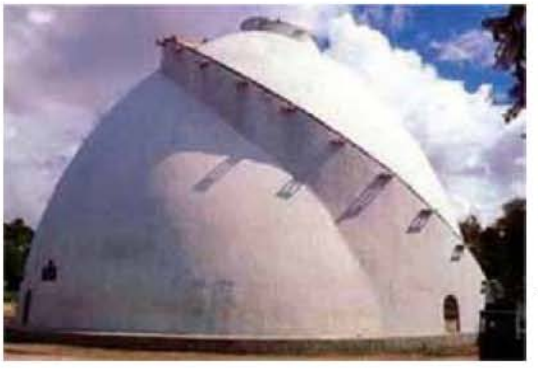

انگریز کیپٹن جان گارسٹن اس وقت صوبہ بہار کا حاکم تھا۔وہ ایک رحم دل انسان تھا اور عوام کی بھلائی کے لیے اس نے کئی کام کیے تھے۔اسی نے

1786 میں پٹنہ میں گول گھر کی تعمیر کرائی۔ گول گھر کی شکل میں اس نے ایک بڑا اناج گھر بنایا جس میں قحط سے نمٹنے کے لیے ایک لاکھ چالیس ہزار ٹن اناج سال بھر محفوظ رکھا جا سکتا تھا۔

گول گھر بنانے کا خیال اسے کس طرح آیا یہ جاننا بھی بڑا دل چسپ ہے۔ جان گارسٹن عیسائی تھا اور اس نے بائبل میں مصر کے زبردست قحط کی داستاں پڑھی تھی کہ خدا کے پیغمبر حضرت یوسفؑ نے کس دور اندیشی اور عقل مندی سے مصر کے عوام کو قحط سے بچایا تھا۔ اناج جمع رکھنے کے لیے حضرت یوسفؑ نے جو گول گھر بنوائے ان ہی سے گارسٹن کو ایک زبردست گول گھر بنانے کا خیال آیا۔

گیرسٹن نے مستقبل میں قحط اور دوسری قدرتی آفتوں میں لوگوں کو بھکمری سے بچانے کے لیے ہر سال اناج ذخیرہ کرنے کا منصوبہ بنایا۔ لیکن اس کے لیے پٹنہ شہر میں کوئی بڑا گودام موجود نہیں تھا۔ چنانچہ اس نے بہت غور کرنے کے بعد دریائے گنگا کے ساحل پر ایک بڑی گنبد نما عمارت بنانے کا نقشہ تیار کیا جس کا نتیجہ گول گھر کی صورت میں ہمارے سامنے ہے۔ اب اسے کوئی گول گھر کہہ لے یا گودام، بات ایک ہی ہے کیونکہ یہ صرف اناج کی ذخیرہ اندوزی کے لیے تعمیر کیا گیا تھا۔ یہ پٹنہ شہر کے تاریخی گاندھی میدان کے مغرب میں واقع ہے جہاں اس کی چھت سے سارا پٹنہ شہر نظر آتا ہے۔

گول گھر کی بلندی 29 میٹر ہے اور اس کے گنبد کے اوپر تک آنے جانے کے لیے اس میں دو طرفہ 145 قدمچوں والے زینے بنے ہیں۔ ان ہی سیڑھیوں کے ذریعے لوگ اس کی آخری منزل تک پہنچتے

ہیں اور وہاں سے پورے پٹنہ شہر کا نظارہ کرتے ہیں۔ ہندوستان کی آزادی سے پہلے جب کلکتہ اور پٹنہ کے درمیان لوگوں کے آنے جانے اور سامان ڈھونے کے لیے صرف پانی کا راستہ تھا اسی گول گھر کے قریب گنگا کے کنارے بندرگاہ واقع تھی، جہاں کلکتہ، ممبئی اور مدراس سے آنے والے چھوٹے مال بردار جہاز لنگر ڈالتے تھا اور ان سے تجارتی سامان اتارا اور چڑھایا جاتا تھا۔

گول گھر کی بنیاد 125 میٹر چوڑی ہے اور اوپر یہ گولائی کم ہوتی جاتی ہے۔ اس کی دیواریں 3.6 میٹر موٹی ہیں، اور موٹائی ہی اسے تقریباً ڈھائی سو سال سے قائم رکھے ہوئے ہے۔ یہاں ہزاروں ٹن اناج کی ہرسال ذخیرہ اندوزی ہوتی آئی ہے۔ اناج کی حفاظت کا یہاں معقول انتظام تھا، سال بھر کے لیے جس قدر اناج یہاں رکھا جاتا تھا۔ اسے سال کے ختم ہونے تک ضرورت مندوں میں تقسیم کردیا جاتا تھا اور دوسرے سال کے لیے پھر سے اناج کی ذخیرہ اندوزی کی جاتی تھی۔

صوبہ بہار میں درجنوں بڑی ندیوں کے علاوہ ان سے نکلنے اور ان میں ملنے والی بہت سی ندیاں ہیں اور ان ندیوں میں پانی چڑھنے کی وجہ سے برسات میں یہاں ہرسال سیلاب کی مصیبت آجاتی ہے۔ اس سے بہت سے شہروں اور دیہات میں آنے جانے کے راستے بند ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ صرف سوکھے کے دنوں میں ہی نہیں سیلاب کے موقع پر بھی گول گھر میں رکھا ہوا اناج لوگوں کے کام آتا ہے۔ حکومت ہرسال کاشت کاروں کو اچھی خاصی قیمت دے کر ان سے اناج خریدتی ہے اور یہ اناج سبھی ضرورت مند لوگوں میں حساب سے تقسیم کر دیا جاتا جاتا ہے۔ لوگوں تک اناج پہنچانے کے لیے حکومت بہار کے ہر سیلابی ضلع اور بلاک میں کشتیاں فراہم کرتی ہے جن پر سوار ہوکر علاقے کے افسر اور ان کے عملے کے لوگ باڑھ میں گھرے لوگوں کو ریلیف کا اناج تقسیم کرتے ہیں۔

تاریخی گول گھر جس زمانے میں تعمیر کیا گیا اس وقت پٹنہ شہر میں اس سے اونچی کوئی عمارت نہیں تھی۔ اس میں اناج رکھنے کا عجیب طریقہ تھا۔ مزدور لوگ ایک طرف کی سیڑھیوں سے اناج کی بوریاں لے کر اوپر جاتے اور چوٹی پر موجود دروازہ سے یہ بوریاں نیچے گرا کر دوسری جانب کی سیڑھیوں سے نیچے اتر جاتے تھے۔ یہ کام دوطرفہ سیڑھیوں کی وجہ سے آسانی کے ساتھ ہوجاتا تھا۔ دوطرفہ سیڑھیوں کی تعمیر واقعی انجینئر گارسٹن کی ذہانت کا ثبوت ہیں۔ گول گھر جس زمانے میں تعمیر کیا گیا اس وقت بہار کی آبادی موجودہ آبادی سے بے حد کم تھی، اور گول گھر کی

◄گول گھر سے اناج نکالنے کا راستہ ▲اوپر اناج کی بوریاں ڈالنے سوراخ اور لوگوں کی چھوڑی ہوئی گندگی

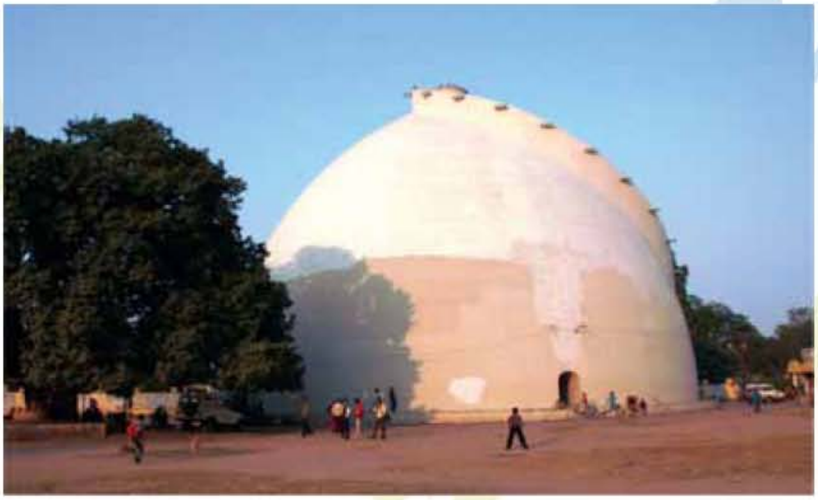

تعمیر اُس زمانے کی آبادی کو نظر میں رکھ کر کی گئی تھی۔ پھر بھی آج آبادی بڑھنے کے باوجود یہ عمارت لاکھوں لوگوں کا پیٹ بھرنے کے لیے ضروری اناج اپنے شکم میں رکھ سکتی ہے۔

گول گھر کا دروازہ بھی عجیب انداز سے ڈیزائن کیا گیا ہے۔ باہر سے دیکھنے سے ایسا لگتا ہے گویا اس عمارت کا کوئی باقاعدہ دروازہ نہیں ہے اور بس عمارت کی چوٹی تک آنے جانے کے لیے دوطرفہ سیڑھیاں بنادی گئی ہیں۔ اگر ایک ہی طرف کی سیڑھیاں ہوتیں تو چوٹی تک اناج کی منتقلی میں مزدوروں کو کافی دشواری پیش آتی اور دیر بھی لگتی۔

چونکہ انگریزوں کی حکومت کے دنوں میں ہندوستان میں صرف دو زبانیں (اردو، انگریزی) رائج تھیں، چنانچہ اس کی دیوار پر نصب سنہری تختی پر اس کی تاریخ تعمیر اور تعمیر کی وجہ صرف اردو اور انگریزی میں لکھی ہوئی ہے۔ طرزِ تحریر دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ اس کی کتابت کس ماہر خوشنویس سے کرائی گئی ہے جو کہ موجودہ کمپیوٹر کتابت سے بھی زیادہ اچھی لگتی ہے۔

▲ 1951میں کھینچی گئی گول گھر کی تصویر

پٹنہ میں 1971 میں ایسا زبردست سیلاب آیا تھا جس کی دوسری مثال نہیں ملتی۔ اس کی وجہ سے لگ بھگ پورا پٹنہ شہر پانی میں ڈوب گیا تھا۔ اس موقع پر گول گھر میں جمع کیا گیا اناج بہت کام آیا تھا۔ 1982 میں بہار کے سہرسہ شہر میں کوشی ندی کا پشتہ ٹوٹنے سے وہاں کی ساری آبادی پانی میں گھر گئی تھی۔ اس وقت بھی پٹنہ کے گول گھر سے وہاں کے لوگوں کو زبردست مدد ملی تھی۔

اس کی اہمیت اور لوگوں میں اس کی مقبولیت کو دیکھ کر حکومت نے 2002 میں یہاں مرمت کرائی، پورے گول گھر کو نیا رنگ دیا گیا اور اب یہ کافی خوب صورت لگتا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ یہاں آنے والے لوگوں نے گندگی پھیلانی کی اپنی عادت ابھی تک نہیں چھوڑی ہے۔ ہمیں یاد رکھنا چاہیے کہ گول گھر بہار کا ایک تاریخی سرمایہ ہے۔ اس کے حسن کو قائم رکھنا ہماری ذمہ داری ہے۔ حکومت کو بھی چاہیے کہ وہ گول گھر کی حفاظت اور دیکھ ریکھ پر مناسب توجہ دے۔ ممکن ہو تو اور شہروں میں بھی اناج کو جمع رکھنے کے لیے ایسے ہی انتظام کرے تاکہ قدرتی آفتوں کے دوران کسی کو بھی بھکمری کی مصیبت نہ جھیلنی پڑے۔ □

Mr Zafar Saeedi
102 Ashok Plaza Ist Flr Masaab Tank Hyderabad-500004

زہیب قادری

قدرت کے کھیل نرالے

گھوڑا

بے قابو منہ زور بہت
طاقت کا ہے شور بہت
گھوڑے پر جب کسے لگام
انسان کا وہ بنے غلام

گائے

بھولی بھالی صورت ہے
ممتا کی وہ مورت ہے
گھر آنگن آباد کرے
دودھ دہی سے شاد کرے

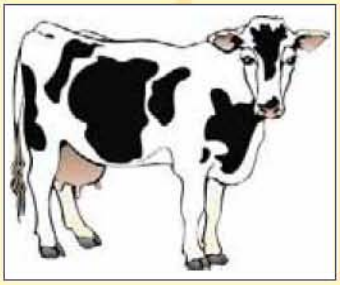

بیل

کھیت ندی اب گھاٹ کہاں
گاؤں کا میلہ پاٹ کہاں
قسمت بھی ہے عجب چڑیل
بے چارہ کولہو کا بیل

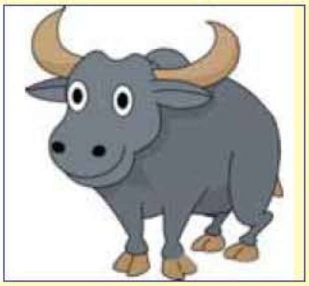

بھینس

بھینس کھڑی پگھراتی ہے
سکھ کی بین بجاتی ہے
بھینس بڑی کہ عقل بڑی
پنڈت نے کیا بات گڑھی

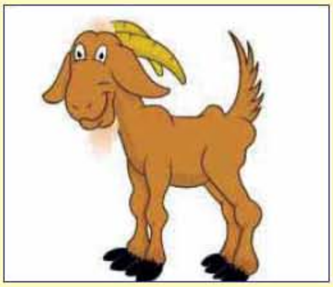

بکری

شوق سے پتے کھاتی ہے
مالک کے گن گاتی ہے
اس میں عجب ہے بھولا پن
موہ لے جیسے سب کا من

گدھا

طیش میں آکر گدھا کہیں
اس کو شاہ خطا کہیں
بوجھ وہ سب کا ڈھوتا ہے
عقل کا رونا روتا ہے

اونٹ

اونٹ کی کچھ ہے شان عجیب
پیٹھ پہ ہے کوہان عجیب
خشکی کا سب کہیں جہاز
طے کرتا ہے سفر دراز

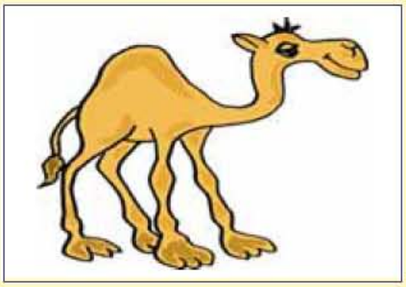

Mr Zoheb Qadri Asif Kirana Merchant Farwapur Talluqa
Poigaon Distt Aurangabad- 431118 Maharashtra

بھولے بھالو کی حماقتیں

بھولے بھالو نے فلم بنائی

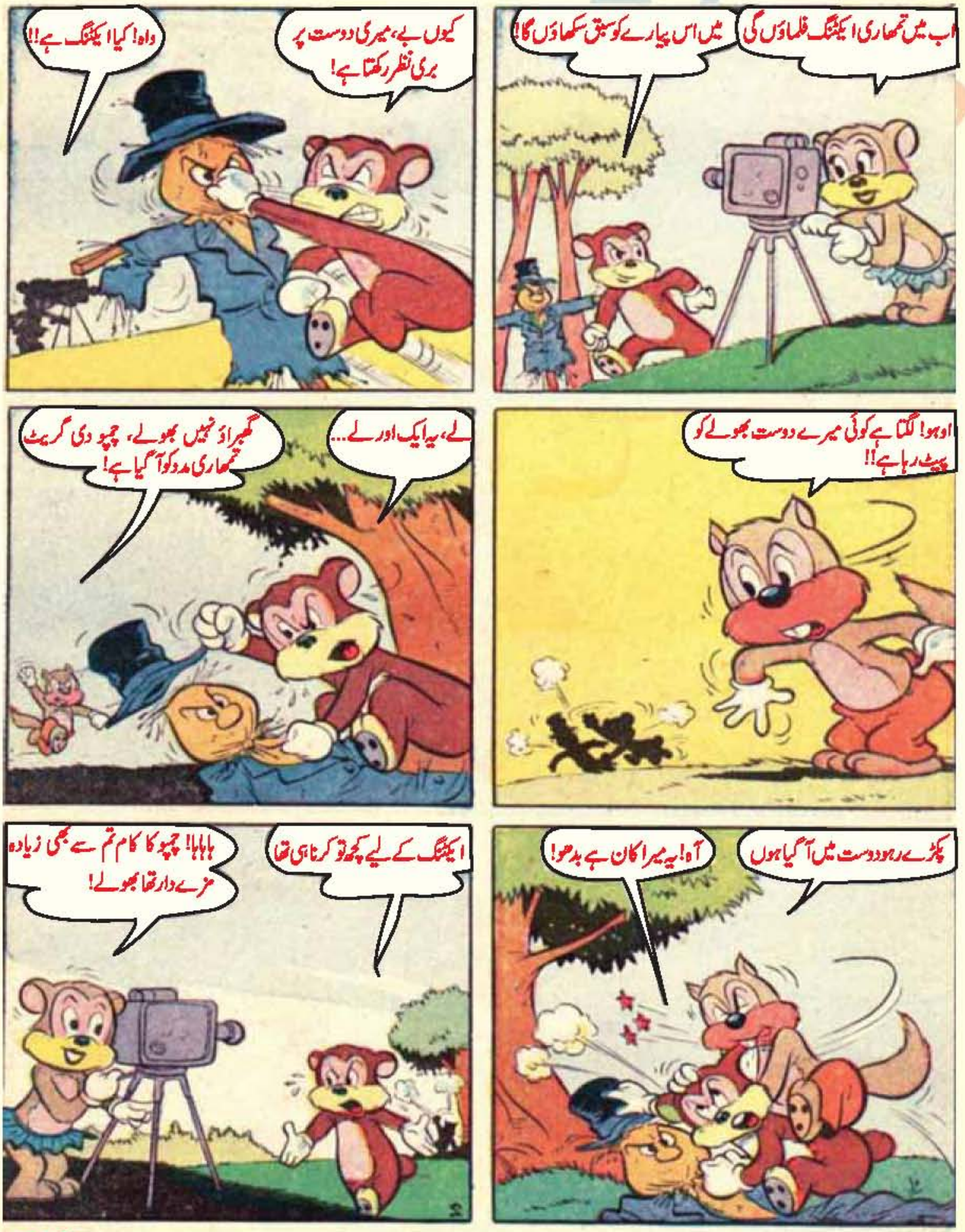
اب میں تمھاری ایکٹنگ فلماؤں گی
میں اس پیارے کو سبق سکھاؤں گا!
کیوں بے، میری دوست پر بری نظر رکھتا ہے!
واہ! کیا ایکٹنگ ہے!!
اوہو! لگتا ہے کوئی میرے دوست بھولے کو پیٹ رہا ہے!!
لے، یہ ایک اور لے...
گھبراؤ نہیں بھولے، چمپو دی گریٹ تمھاری مدد کو آ گیا ہے!
پکڑے رہو دوست میں آ گیا ہوں
آہ! یہ میرا کان ہے بدھو!
ایکٹنگ کے لیے کچھ تو کرنا ہی تھا
ہاہاہا! چمپو کا کام تم سے بھی زیادہ مزے دار تھا بھولے!

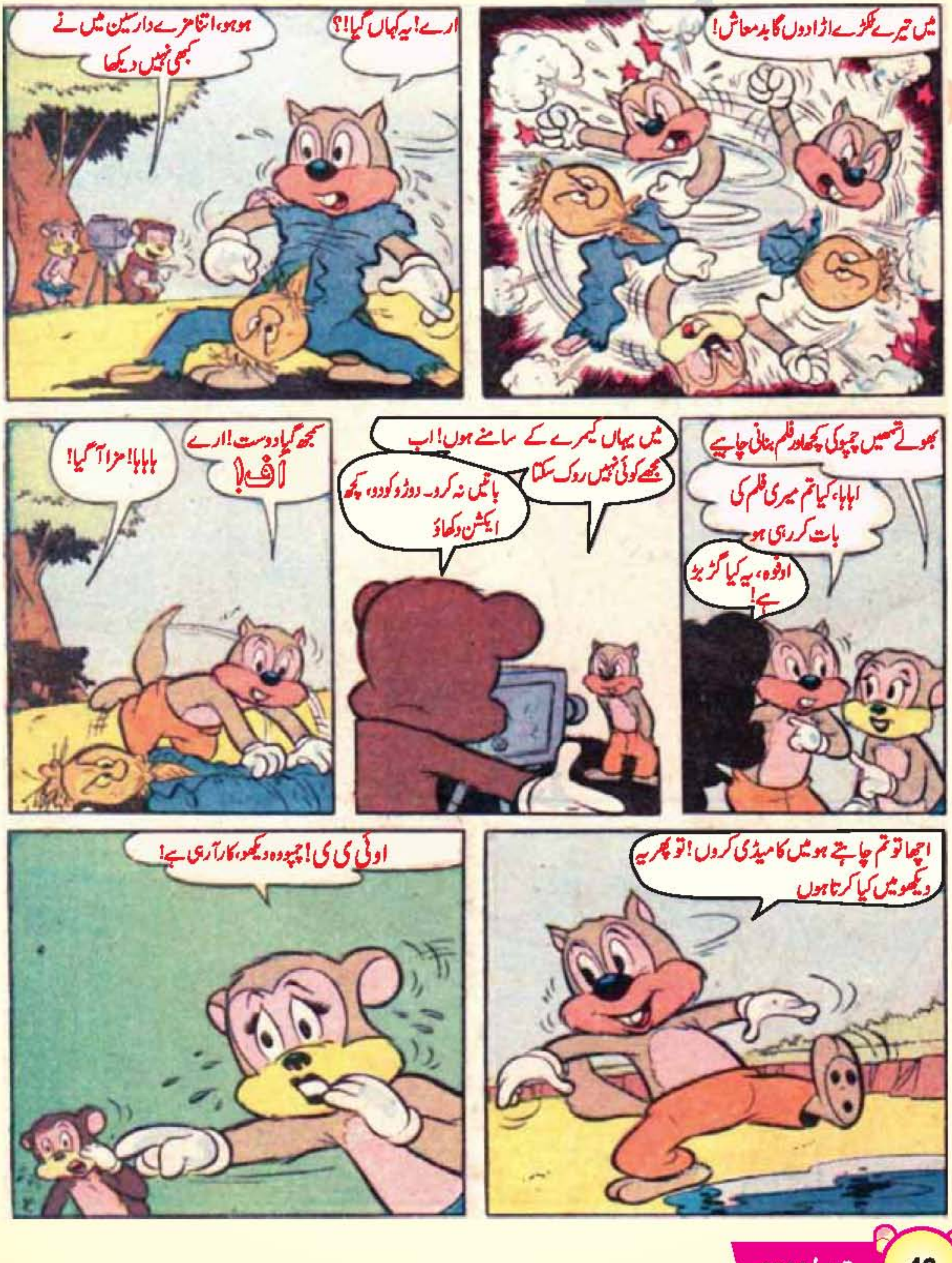
میں تیرے ٹکڑے اڑا دوں گا بدمعاش!
ارے! یہ کہاں گیا!؟
ہوہو، اتنا مزے دار سین میں نے کبھی نہیں دیکھا
بھولے تمھیں چمپو کی کچھ اور فلم بنانی چاہیے
اہاہا، کیا تم میری فلم کی بات کر رہی ہو
اوفوہ، یہ کیا گڑبڑ ہے!
میں یہاں کیمرے کے سامنے ہوں! اب مجھے کوئی نہیں روک سکتا
باتیں نہ کرو۔ دوڑو کودو، کچھ ایکشن دکھاؤ
سمجھ گیا دوست! ارے
اُف!
ہاہاہا! مزا آگیا!
اچھا تو تم چاہتے ہو میں کامیڈی کروں! تو پھر یہ دیکھو میں کیا کرتا ہوں
اوئی ی ی! چمپو وہ دیکھو، کار آرہی ہے!

اوہ خدا! بے چارا چمپو...
ہائے! غریب چمپو
ہائے بھولے! دیکھو تو بے چارا آخر کہاں گیا؟
اف! جتنا میں نے سوچا تھا یہ تالاب اس سے زیادہ گہرا ہے
اوہ چمپو تم واقعی بہت عجیب ہو! تم جیسا اور کوئی نہیں
یہ اسکرین ٹیسٹ مجھے یقیناً فلم اسٹار بنا دے گا
یہ بھی ہو سکتا ہے ایک دن میری کارٹون فلمیں بننے لگیں
میرے پیڑ سے دور ہٹو!
آئی ای ی!
ریٹ ٹیٹ ٹیٹ ٹیٹ

واہ! کیا شاٹ ہے چمپو
آؤچ!
دیکھو چمپو نئے شاٹ کے لیے کہاں چڑھ رہا ہے
اب دیکھنا بھولو میں کیسا نڈر ہوں!
سنبھل کے چمپو!
بلب!
شڑاپ!
میں چمپو کی مدد کرتا ہوں بھولی ڈیئر مگر کیمرہ چلنے دینا
میں یہ شاٹ چھوٹنے نہیں دوں گی بھولے
شڑاپ!
یہ کسی کمزور کے بس کا نہیں ہے!
میرا خیال ہے چمپو اب تمھیں بھولے کے اوپر سے اتر آنا چاہیے

Buster Bear سے ماخوذ/ترجمہ: شبنم پروین

شیلیندر

میں تو چلی کاشی...

بچے چھپا چھپی چھپا چھپی آگڑ باگڑ جائی رے
چوہے ماما چوہے ماما بھاگ بلی آئی رے

بلی بلی بولی میاؤں کاہے گھبراؤ
میں تو چلی کاشی گلے مل جاؤ

بچے مت ہم کو بنا اری موسی تیرے دل میں ضرور ہے کالا
کسی اور کو دکھلا جاکے یہ جوگ یہ کنٹھی مالا

بلی رام کا نام لو آنکھ سے کام لو
کل جو ہوا تھا بھول جاؤ بھول جاؤ

بچے چھپا چھپی چھپا چھپی آگڑ باگڑ جائی رے
چوہے ماما چوہے ماما بھاگ بلی آئی رے

بلی میں تو رام کی جوگن اپنا پرلوک سدھارن جاؤں
آخر کو بڑھاپا ٹھہرا اب لوٹ کے آؤں نہ آؤں

بچے دانت بھی تیز تیرے پنجے بھی تیز ہیں
من میں وہی ہے داؤ لگے تو لگاؤ

بلی بلی بولی میاؤں کاہے گھبراؤ
میں تو چلی کاشی گلے مل جاؤ

بچے چھپا چھپی چھپا چھپی آگڑ باگڑ جائی رے
چوہے ماما چوہے ماما بھاگ بلی آئی رے

□رجب علی بیگ سرور

6

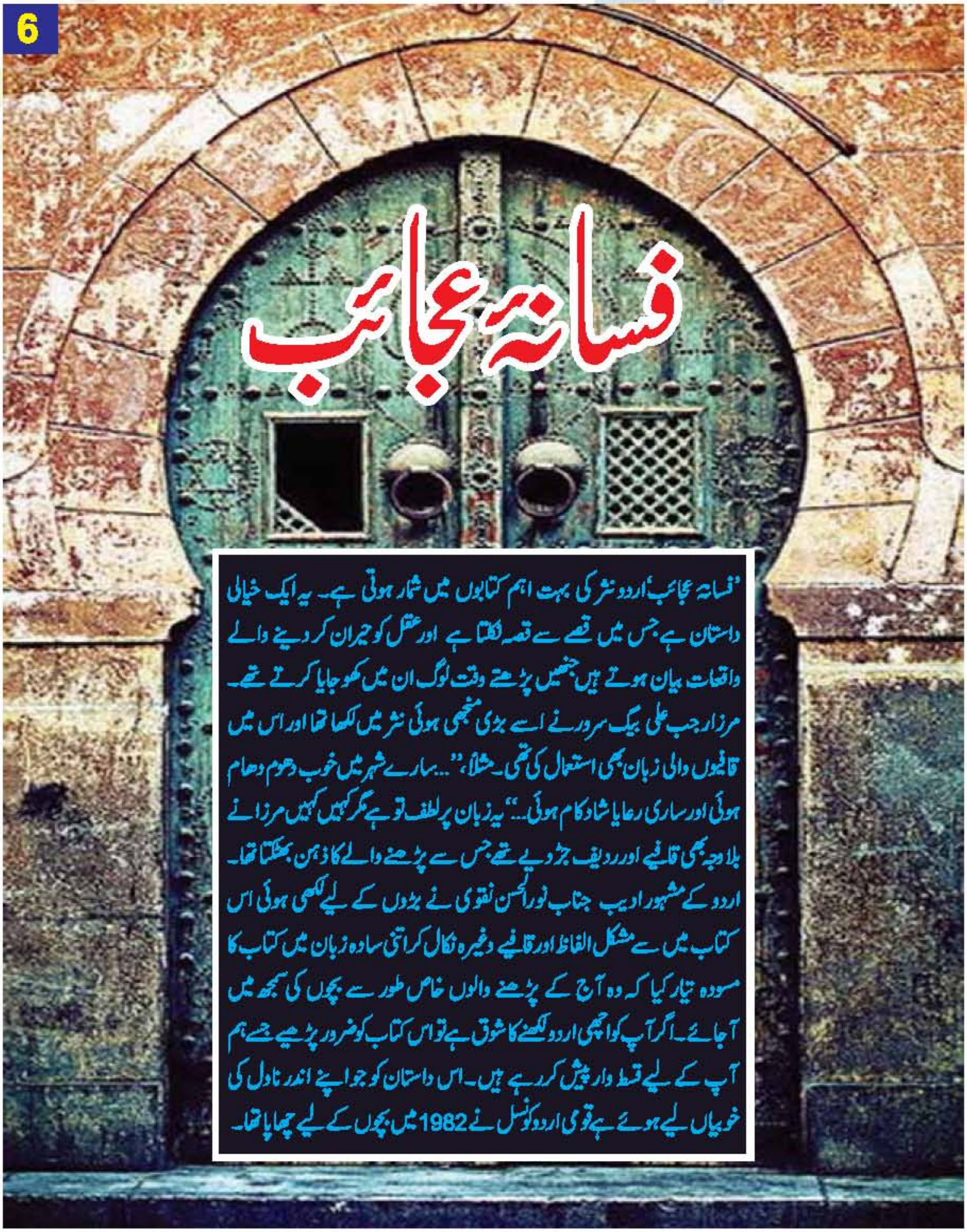

فسانۂ عجائب

'فسانۂ عجائب' اردو نثر کی بہت اہم کتابوں میں شمار ہوتی ہے۔ یہ ایک خیالی داستان ہے جس میں قصے سے قصہ نکلتا ہے اور عقل کو حیران کر دینے والے واقعات بیان ہوتے ہیں جنھیں پڑھتے وقت لوگ ان میں کھو جایا کرتے تھے۔ مرزا رجب علی بیگ سرور نے اسے بڑی منجھی ہوئی نثر میں لکھا تھا اور اس میں قافیوں والی زبان بھی استعمال کی تھی۔ مثلاً، "...سارے شہر میں خوب دھوم دھام ہوئی اور ساری رعایا شادکام ہوئی..." یہ زبان پرلطف تو ہے مگر کہیں کہیں مرزا نے بلا وجہ بھی قافیے اور ردیف جڑ دیے تھے جس سے پڑھنے والے کا ذہن بھٹکتا تھا۔ اردو کے مشہور ادیب جناب نورالحسن نقوی نے بڑوں کے لیے لکھی ہوئی اس کتاب میں سے مشکل الفاظ اور قافیے وغیرہ نکال کر اتنی سادہ زبان میں کتاب کا مسودہ تیار کیا کہ وہ آج کے پڑھنے والوں خاص طور سے بچوں کی سمجھ میں آ جائے۔ اگر آپ کو اچھی اردو لکھنے کا شوق ہے تو اس کتاب کو ضرور پڑھیے جسے ہم آپ کے لیے قسط وار پیش کر رہے ہیں۔ اس داستان کو جو اپنے اندر ناول کی خوبیاں لیے ہوئے ہے قومی اردو کونسل نے 1982 میں بچوں کے لیے چھاپا تھا۔

اب تک آپ نے پڑھا : ملک ختن میں ایک بادشاہ تھا فیروز بخت۔ شہزادہ جان عالم اس کا اکلوتا بیٹا تھا۔ ایک دن شہزادے نے ایک بولنے والا طوطا بازار سے خریدا۔ طوطا دنیا بھر کی باتیں جانتا اور شہزادے کو بتاتا تھا۔ ایک دن اس نے بتایا کہ ملک زرنگار کی ملکہ انجمن آرا دنیا کی سب سے خوب صورت ملکہ ہے۔ شہزادہ بنا دیکھے ہی فداہوکر انجمن آرا کی تلاش میں نکل پڑا۔ راستے میں کئی مشکلیں آئیں۔ ایک جگہ غلطی سے ایک جا دوگر نی کے جال میں پھنس گیا جو اسے اپنے محل لے گئی اور اس سے زبردستی شادی رچانے لگی۔ جان عالم کسی طرح اس کی قید سے نکل آیا۔ راستے میں اسے ملکہ مہر نگاراپنی خواصوں کے ساتھ ملی اور گھر لے گئی۔ ملکہ نے جان عالم کا قصہ سن کر اسے اپنے والد سے ملا یا جو بادشاہت چھوڑکر عبادت گزار بن چکے تھے۔ انھوں نے جان عالم کو ایک لوح دی جو دراصل خدا کے ناموں کا ایک تعویذ تھی اور ہرجادو کوتوڑدیتی تھی ۔مہر نگار اوراس کے والد سے رخصت ہو کر جان عالم آگے سفر پر چل پڑااور ملک زرنگار پہنچاجہاں پتہ چلا کہ انجمن آرا ایک جادوگر کی قید میں ہے۔ جان عالم جادوگر سے لڑنے چل دیا اورلوح کی مدد سے کامیاب رہا۔انجمن آراکی واپسی پر اس کا باپ جو کہ ملک کا بادشاہ تھا اس قدر خوش ہوا کہ اس نے جان علم سے انجمن آرا کی شادی کردی۔کچھ د ن گزرے توجان عالم کو گھر کی یاد ستانے لگی۔ بادشاہ نے بڑے اہتمام سے بیٹی اور دامادکورخصت کیا۔ راستے میں ان کی ملاقات ملکہ مہرنگار اور اس کے بزرگ والد سے ہوئی ۔ دونوں کچھ روز ان کے ساتھ رہے۔ مہر نگاراب بھی جان عالم کو چاہتی تھی۔ دونوں کی شادی ہو گئی۔ جان عالم دونوں بیویوں کو لے کر وطن واپس چلا تو بزرگ نے دوسرے جان دار میں روح داخل کرنے کی ترکیب اسے بتائی اور کہا کہ کسی کو یہ بھید نہ بتاناورنہ دکھ اٹھاؤ گے۔مگر اس نے اپنے دوست وزیرزادے کو یہ راز بتادیا۔لالچی دوست نے دھوکے سے جان عالم کو بندر کے جسم میں داخل کرا دیااور خود جان عالم بن گیا مگر د ونوں بیویوں کو اس پر شک ہو گیا اوروہ اس سے دور رہنے لگیں۔ اب آگے پڑھیے :

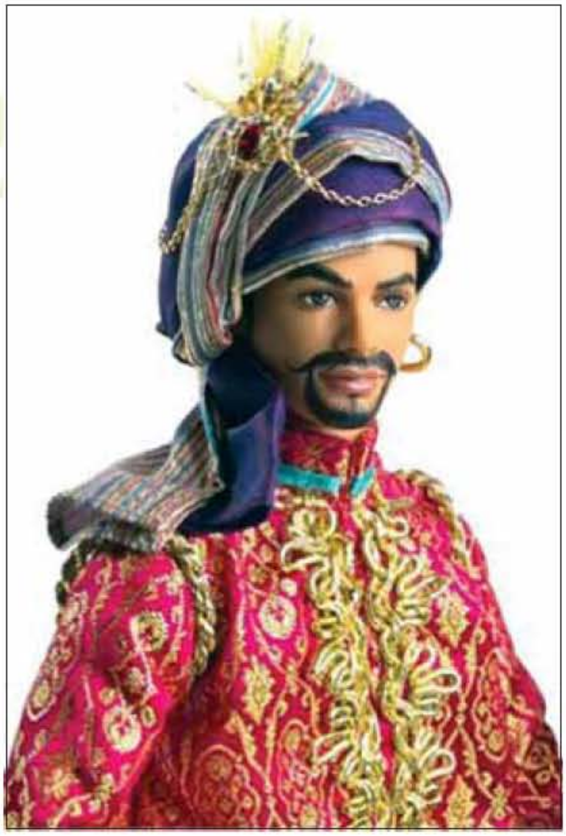

چند روز بعد فرصت ملی تو اس بدمعاش کو یہ خیال آیا کہ جان عالم آزاد ہے تو کون جانے کیا مصیبت آئے اور ابھی تو وہ بندر کی شکل میں پھرتا ہوگا کل خدا جانے کیا کرے۔ ملکہ کے باپ کی طرف سے بھی اسے برابر کھٹکا لگا رہتا تھا۔ دل میں یہ بات ٹھہرائی کہ جس طرح بن پڑے جان عالم کو جان سے مار ڈالیے پھر عیش کیجیے۔ یہ سوچ کے حکم جاری کیا۔ ”ہمیں بندروں کی ضرورت ہے جو کوئی ایک بندر لائے گا دس روپے پائے گا۔“

اہل شہر ہزاروں بندر پکڑ لائے۔ یہ ہر بندر کو غور سے دیکھتا اور اس کا سر اتروا دیتا۔ تھوڑے ہی دنوں میں ہزاروں بندر ہلاک ہوگئے۔ جب بندر کم رہ گئے تو ان کے دام بڑھ گئے یہاں تک کہ ایک بندر کی قیمت سو روپے ہوگئی۔ میلوں دور تک بندروں کا نام ونشان مٹ گیا۔ چنانچہ وہیں کے بھاگے ہوئے بندر آج تک متھرا اور بندرابن میں

پائے جاتے ہیں۔

اسی بستی میں ایک چڑی مار بھی رہتا تھا فاقوں کا مارا اور ٹوٹے پھٹے حالوں میں۔ دن بھر کی بھاگ دوڑ میں دو چار جانور ہاتھ آتے اور دو چار پیسے میں بک جاتے اسی سے گزر بسر ہوتی اور دونوں کو چٹنی روٹی میسر ہوتی۔ کسی دن جانور ہاتھ نہ لگتے تو فاقے کرتا۔ ایک دن چڑی مار کی بیوی اس سے کہنے لگی ”تو تو نرا احمق ہے۔ سارے سارے دن جانوروں کی تلاش میں بولا یا پھرتا ہے۔ الو کی طرح ویرانے جھانکتا ہے۔ پھر بھی پیٹ میں نہ روٹی ہے نہ تن پہ لتا۔ اگر کسی تدبیر سے ایک بندر تیرے ہاتھ آجاتا تو دن پھر جاتے۔ کچھ دن آرام سے کٹ جاتے۔“

سچ ہے لالچ بری بلا ہے۔ اس کی سمجھ میں بیوی کی بات آ گئی بولا ”کہیں سے مانگ کے آٹا لا، روٹی پکا اور جس طرح بن پڑے تھوڑے چنے منگا۔ صبح بندر کی تلاش میں جاؤں گا اور اپنا نصیب آزماؤں گا۔“

اس نے مانگ تانگ کے سامان جمع کر دیا۔ دو گھڑی رات رہے چڑی مار اٹھ کھڑا ہوا اور دن کی طرح نہ جال لیا اور نہ پھنکی۔ لاسا اور کپا بھی گھر ہی میں چھوڑا۔ بس روٹی، چنے اور رسی لے کے چل نکلا۔ شہر کے آس پاس تو بندر رہے نہ تھے۔ چھ سات کوس نکل کے بندر ڈھونڈنے لگا۔

اب ادھر کا حال سنو۔ شہزادہ تو بندر بن ہی چکا تھا۔ اس نے جب سے یہ سنا تھا کہ بندر پکڑے جاتے ہیں اور اس کا فریبی یاران کے سر تڑواتا ہے، اسی دن سے چھپتا پھرتا تھا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ پکڑا جاؤں

اور جان سے ہاتھ دھوؤں۔ اس روز وہ کئی دن کا بھوکا پیاسا تھا۔ کمزوری سے نہ چلا جاتا تھا۔ ایک درخت کی کول میں غش ہو کر پڑا تھا۔ چڑی مار نے دیکھا، دبے پاؤں آ کے گردن پکڑلی۔ اس نے آنکھ کھولی کہ

گردن موت کے پنجے میں پھنسی ہے۔ یقین ہو گیا کہ اب عمر کے دن پورے ہو گئے۔ چڑی مار نے کمر سے رسی کھول کے بندر کو کس کے باندھ لیا اور شہر کا رستہ لیا۔

تھوڑی دور تک تو بندر چپ رہا پھر چڑی مار سے بولا ”اے بھائی تو کیوں مجھ مصیبت کے مارے کو ستاتا ہے۔ خواہ مخواہ مجھ بے گناہ کا خون اپنی گردن پر لیتا ہے۔“

وہ بولا ”اچھی کہی۔ تو انسانوں کی طرح بول کر مجھے ڈراتا ہے۔ اگر تو جن بھوت، دیو بلا ہے تو بھی میں تجھے چھوڑ نہیں سکتا۔ آج دن پھرے ہیں، تجھے لے جا کے بادشاہ کو دوں گا، سو روپے لوں گا اور چین کروں گا۔“

وہ یہ سن کر سن ہی تو ہو گیا۔ رہی سہی جان بھی نکل گئی۔ چڑی مار کو بہت سمجھایا کہ لالچ بری بلا ہے مگر اس نے ایک نہ سنی اور تیز تیز قدم بڑھتا رہا۔ شام کے قریب گھر پہنچا۔ بیوی کو خوش خبری سنائی کہ محنت کے بغیر یہ دولت ہاتھ آئی۔

جس دن شہزادہ چڑی مار کے ہاتھ لگا اس دن ملکہ کا دل بہت گھبرایا۔ کسی طرح چین نہ آیا۔ اسی دن انجمن آرا سے کہنے لگی ”تم نے سنا، یہ کم بخت بندر پکڑوا کے ان کے سر کچلواتا ہے۔ میرا دل کہتا ہے ہو نہ ہو جان عالم ان دنوں بندر ہی کے روپ میں ہے اور آج تو خدا خیر کرے، صبح سے میرا دل بری طرح گھبرا رہا ہے۔ خدانخواستہ کہیں

شہزادہ پکڑا نہ گیا ہو۔"

ادھر یہ باتیں ہو رہی تھیں ادھر چڑی مار کی بیوی چراغ لے کے بندر کو دیکھ رہی تھی۔ بندر نے سوچا وہ تو مرد تھا نہ پسیجا۔ یہ عورت ہے۔ کہتے ہیں عورت کا دل نرم ہوتا ہے اس کی خوشامد کر دیکھو۔ یہ سوچ کے اسے سلام کیا۔ وہ بندر کو آدمیوں کی طرح بولتے دیکھ کے ڈر گئی۔ اب اس نے بات شروع کی۔

"اے نیک بخت! خوف نہ کر۔ میری دو باتیں دھیان سے سن لے۔" گنواریاں جی کی کڑی بھی ہوتی ہیں۔ بندر کا بولنا اچنبھا سمجھ کے کہا "کہہ!"

وہ بولا "ہم غریب الوطن، مصیبتوں میں گرفتار، گھر سے دور اور قید میں مجبور ہیں۔ ماں باپ نے بڑے نازوں سے پالا مگر قسمت کے آگے کس کی چلتی ہے۔ ہم دردر کی ٹھوکریں کھانے اور اس حال کو پہنچنے کے لیے گھر سے نکلے۔ یہاں تک کہ اب اس شکل میں گرفتار ہو کے تیرے سامنے آئے صبح کو ہم گردن مارے جائیں گے۔ تب سو روپے تمہارے ہاتھ آئیں گے۔ قیامت کے دن تم بے گناہ کی جان لینے کی سزا پاؤ گی اور دوزخ میں جلو گی۔ سو روپے کیا چیز ہیں، کتنے دن کھاؤ گی، ہمارے حال پر رحم کرو۔ خدا کوئی اور صورت کرے گا۔ سو روپے کے بدلے تمہارا گھر اشرفیوں سے بھرے گا۔ تو نے یمن کے بادشاہ کا قصہ نہیں سنا؟ اس نے ایک سلطنت دی، بدلے میں دو پائیں۔ لالچی کی قضا آئی۔"

عورت کا دل پسیجا۔ بندر کی باتوں پر کچھ تعجب کچھ افسوس کر کے کہنے لگی۔ "وہ کہانی کیسی ہے؟ سناؤ مہاراج۔"

شاہ یمن کا قصہ

بندر نے کہا "کسی زمانے میں ملک یمن پر ایک بادشاہ راج کرتا تھا۔ خدا نے اسے بے حساب دولت دی تھی۔ وہ بھی ایسا خدا سے ڈرنے لگا تھا کہ اللہ کی راہ میں سب کچھ نثار کرنے کو سدا حاضر تھا۔ ادھر سائل کے منہ سے سوال نکلا ادھر پورا ہوا۔ اس لیے دور دور خدا دوست کے نام سے مشہور ہو گیا۔

ایک دن کوئی شخص آیا اور سوال کیا "اگر خدا کا دوست ہے تو اللہ کے واسطے تین دن مجھے حکومت کرنے دے۔"

بادشاہ نے کہا "بسم اللہ! اور حکومت کے سارے ملازموں، امیروں، وزیروں کو تاکید کی کہ ہر طرح اس کا حکم بجالائیں۔ جو اس میں کوتاہی کرے گا سزا پائے گا۔"

چوتھے روز بادشاہ نے پوچھا "اب کیا ارادہ ہے؟" وہ بولا "پہلے تو تیرا امتحان لینا تھا، اب بادشاہت کا مزہ پڑ گیا، خدا کے واسطے یہ تخت وتاج ہمیشہ کے لیے مجھے بخش دے۔"

بادشاہ نے کہا "یہ حکومت آپ کو مبارک ہو۔" سب کچھ اسی کو بخش دیا۔ خزانے میں سے کچھ بھی نہ لیا۔ اس کے دو بیٹے تھے ایک سات برس کا، دوسرا نو برس کا۔ ان دونوں کا ہاتھ تھاما، بیوی کو ساتھ لیا اور پیادہ پا محتاجوں کی طرح چل نکلا۔ کسی دن دو کوس کا سفر کرتا، کسی دن چار کوس کا، کسی بستی میں کوئی روزی میسر آ گئی تو ٹھیک ورنہ روزہ رکھ لیتا۔

کچھ دنوں چلنے کے بعد ایک شہر میں آ پہنچا اور مسافر خانے میں اترا۔ اتفاق سے اسی وقت ایک سوداگر بھی کہیں سے وہاں آ پہنچا۔ اس کا قافلہ تو دور تھا۔ یہ گھوڑے پہ سوار سیر کرتا مہمان سرا تک چلا آیا ملکہ کو دیکھا۔ اس کا چہرہ سفر کی وجہ سے گرد میں اٹ گیا تھا مگر چاند بادلوں کی اوٹ میں بھی اچھا لگتا ہے۔ سوداگر کو ملکہ بہت پسند آئی اور وہ اسے حاصل کرنے کی ترکیبیں سوچنے لگا۔

سوداگر جی میں کچھ سوچ کر اور مصیبت کے ماروں کی سی شکل بنا کر بادشاہ کے پاس آیا۔ سلام کیا اور بولا ”اے عزیز! میں تاجر ہوں، قافلہ باہر اترا ہے، میری بیوی بیمار ہے، بچہ ہونے والا ہے، یہاں کوئی نہیں جو اس کی دیکھ بھال کر سکے۔ تو نیک بخت ہے، ذرا دیر کے لیے اپنی بیوی کو میرے ساتھ کر دے ورنہ اس غریب کی جان جائے گی۔“

اس نے بیوی سے کہا ”یہ بھی خوش نصیبی ہے کہ ہم اس محتاجی میں بھی کسی کے کام آسکیں۔ تو اس کے ساتھ جا اور اس عورت کی جان بچا۔“ اس بے چاری نے دم نہ مارا۔ فوراً سوداگر کے ساتھ روانہ ہوئی۔ اس نے دروازے سے نکل کے اس غریب سے کہا ”قافلہ دور ہے، آپ گھوڑے پر چڑھ لیں تاکہ جلدی پہنچ کے اس کی دیکھ بھال کریں۔“

وہ غریب اس کا فریب نہ جانتی تھی، گھوڑے پر سوار ہوگئی۔ سوداگر اسے لیے قافلے کے پاس پہنچا اور کوچ کا حکم دے دیا۔ اب تو بے چاری بہت روئی پیٹی چیخی چلائی مگر اس کا دل پتھر تھا۔ اس میں جونک نہ لگی۔ بادشاہ نے بہت دیر انتظار کیا۔ پھر اسے ڈھونڈنے نکلا، قافلہ روانہ ہو چکا تھا، دور گرد اڑتی نظر آتی تھی۔ پیچھا کرنا بے سود تھا، صبر کر لیا۔ بچوں کو ساتھ لے کے روانہ ہوا، راستہ بھول گیا، ایک ندی ملی مگر پار کرنے کو کوئی کشتی نہ تھی۔ ایک بیٹے کو کنارے پر بٹھایا اور دوسرے کو کندھے پر چڑھا کر دریا پار کرنے لگا۔ ابھی آدھے راستے میں تھا کہ کنارے والے لڑکے کو بھیڑیا اٹھا لے چلا۔ وہ چلایا تو وہ گھبرا کے مڑا۔ اس میں کندھے کا بچہ دریا میں گر پڑا خود بھی غوطے کھانے لگا مگر بڑی مشکل سے کنارے پر پہنچا۔

تخت چھوٹا، بیوی چھوٹی، دونوں بچے خدا کو پیارے ہوئے۔ اب

خدا دوست تھا اور اتنے بہت سے غم۔ اسی پریشانی میں خدا کا شکر ادا کرتا چلا جاتا تھا۔ سہ پہر کو ایک شہر کے قریب پہنچا۔ شہر پناہ کے دروازے پر بھیڑ جمع تھی، ادھر آیا۔ اس ملک میں یہ دستور تھا کہ بادشاہ مر جاتا تو امیر وزیر شہر کے باہر جمع ہو جاتے اور ایک باز اڑاتے۔ یہ باز جس کے سر پر بیٹھ جاتا اسی کو بادشاہ بناتے۔ یہ وہی دن تھا، باز چھوڑا جا چکا تھا مگر ابھی تک کسی کے سر پر نہ بیٹھا تھا، اس فقیر صورت بادشاہ کا وہاں پہنچنا تھا کہ باز اس کے سر پر آ بیٹھا۔ فوراً اس کی خدمت میں تخت پیش کر دیا گیا۔ اس نے ہر چند انکار کیا کہ میں اس قابل نہیں۔ جس بلا کو چھوڑ کے نکلا ہوں وہی گلے پڑتی ہے، مگر کوئی نہ مانا۔ اسے تخت پر بٹھا کے نذریں پیش کی گئیں۔ توپیں داغی گئیں۔ بڑے کروفر کے ساتھ اسے شاہی محل میں لایا گیا اس کے نام کے سکے جاری ہوئے۔ اس نے بھی نہایت عدل و انصاف کے ساتھ حکومت کرنی شروع کر دی۔

اب ان لڑکوں کا حال سنیے۔ جس لڑکے کو بھیڑیا اٹھا لے گیا تھا وہ اس طرح بچا کہ سامنے سے ایک تیر انداز آتا تھا، اس نے تاک کے نشانہ مارا۔ بھیڑیا ڈھیر ہو گیا۔ اس کے اولاد نہ تھی، لڑکے کو اولاد کی طرح پالنے لگا۔ ڈوبنے والے کو ایک تیراک نے بچایا اس کے بھی کوئی اولاد

نہ تھی۔اس طرح دونوں بچے اسی شہر میں پلنے لگے جس میں ان کا باپ حکومت کرتا تھا۔

بادشاہ کو اپنے دونوں بیٹوں کا بہت غم تھا۔اس نے وزیر سے کہا کہ "دولڑکے ہمارے صحبت کے قابل ڈھونڈ کے لا۔" اس نے منادی کرادی۔ مجبوراً سب اپنے اپنے بچوں کو لے کر حاضر ہوئے۔ اتفاق دیکھو کہ یہی دونوں لڑکے وزیر کو پسند آئے۔اب محل میں ان دونوں کی پرورش ہونے لگی۔ مگر قسمت دیکھو کہ تینوں میں سے کوئی ایک دوسرے کو نہ پہنچان سکا۔

کچھ دن بعد وہ دغاباز سوداگر بھی پچھلے بادشاہ کے لیے کچھ سامان لے کر ادھر آیا۔سنا کہ بادشاہ مر گیا۔ بہت ملول ہوا مگر لوگوں نے کہا، نیا بادشاہ اس سے بھی اچھا ہے تو اس کی خدمت میں حاضر ہو۔ چنانچہ یہ حاضر ہوا مگر دونوں ایک دوسرے کو نہ پہچان سکے۔

سوداگر ملکوں ملکوں کی سیر کرتے ہیں۔ گھاٹ گھاٹ کا پانی پیتے ہیں۔ بادشاہ دیر تک اس سے اِدھر اُدھر کے ملکوں کا حال پوچھتا رہا۔ رات ہوگئی تو بادشاہ نے کہا کہ "آج کی رات تو یہیں رہ اور قصے سناتا رہ۔" وہ بہت پریشان ہوا۔ پھر بادشاہ کے پوچھنے پر بتایا کہ "میرے پاس ایک عورت ہے جو میرے ساتھ خوش نہیں، ڈرتا ہوں کہیں وہ نکل نہ بھاگے۔"

بادشاہ نے ان دونوں لڑکوں کو حکم دیا کہ سوداگر کے خیمے پر جائیں اور ساری رات پہرہ دیں، دونوں حکم بجالائے۔

دونوں بھائی خیمے کے دروازے پر کرسی بچھا کے بیٹھ گئے۔ جب آدھی رات گزر گئی تو ایک کو نیند آنے لگی۔ دوسرے نے کہا "سونا مناسب نہیں، ایسا نہ ہو کوئی فتنہ اٹھ کھڑا ہو۔ کوئی ایسی کہانی سناؤ جس سے نیند چٹ جائے۔" اس نے کہا "کہانی کیا ہم آپ بیتی سناتے ہیں۔ اگر غور سے سنو گے تو نیند کیسی، کئی دن تک بھوک پیاس نہ آئے گی۔ سن، اے دوست! میں یمن کے بادشاہ کا بیٹا ہوں۔ میرے باپ نے اپنی سلطنت اللہ کے نام پر ایک سائل کو دے دی۔ مجھے اور میرے بھائی کو جس کی صورت تجھ سے ملتی تھی ساتھ لیا۔ ہماری ماں بھی ہمراہ تھی انجانی منزل کو چل دیا۔ایک مکار تاجر دھوکے سے ہماری ماں کو لے اڑا۔ ہم دونوں بھائی اپنے باپ کے ساتھ رہے۔ وہ مجھے کنارے بٹھا چھوٹے کے کندھے پر چڑھا دریا پار کرتا تھا۔ مجھے بھیڑیے نے پکڑا تو میں چلایا۔ ہمارا باپ ایسا بوکھلایا کہ میرا بھائی اس کے کندھے سے پھسل کے گر پڑا۔ وہ خود بھی نہ سنبھل سکا اور غوطے کھانے لگا۔ مجھے ایک تیرانداز نے بھیڑیے کے منہ سے چھڑایا۔ ماں، باپ اور بھائی پہ کیا بیتی یہ پتہ نہیں۔" یہ سن کر دوسرا بھائی گلے سے لپٹ گیا کہ "جو دریا میں گرا وہ میں تھا، ایک تیراک ماہی گیر نے مجھے موت کے منہ سے بچایا۔" اندر دونوں کی ماں یہ قصہ سنتی تھی۔ اس نے خیمے کا پردہ الٹ دیا اور دونوں بیٹوں کو سینے سے لگایا۔

بادشاہ نے یہ قصہ سنا تو سواری بھیج کے تینوں کو بلایا۔ اس طرح بچھڑے ہوئے پھر سے مل گئے۔ سوداگر بدبخت قید میں ڈالا گیا۔ دن نکلا تو بادشاہ کے حکم سے جلاد نے اس کی گردن ماردی اور دنیا کو اس ملعون سے نجات دلائی۔

یہ قصہ اخباروں میں چھپا۔ یمن کے لوگوں نے پڑھا، وہاں جو سائل حکومت کرتا تھا وہ ظالم نکلا۔ رعایا اس سے عاجز تھی، آخر وزیر نے زہر دے کر اس کا کام تمام کیا اور خدادوست کو لکھا کہ تمہاری رعایا تمہارے لیے بے چین ہے۔ بادشاہ کو بھی وطن کی یاد نے ستایا۔ جلد یمن آیا اور دونوں ملکوں پر حکومت کرنے لگا۔

یہ کہانی سنانے کے بعد بندر اس عورت سے بولا "اے نیک

بخت! تو نے دیکھا جو اللہ کا نیک بندہ تھا اور جسے خدا کا ڈر تھا ہر طرح فائدے میں رہا۔ ایک سلطنت دی تو دو پائیں۔ لالچی تاجر کا حشر بھی تو نے دیکھ لیا۔''

بندر کی باتوں کا عورت پر اثر ہوا اور خدا نے اس کے دل میں رحم پیدا کر دیا۔ بولی ''تو اطمینان رکھ، جیتے جی تو تجھے بادشاہ کو دوں گی نہیں۔ فاقے کر لوں گی مگر سو روپے کا لالچ نہیں کروں گی۔'' اس نے بندر کو روٹی کھلائی، پانی پلایا اور سو رہی۔ صبح کو چڑی مار اٹھا اس نے ارادہ کیا کہ بندر کو بادشاہ کے پاس لے جائے اور انعام پائے۔ عورت نے کہا ''آج پھر قسمت آزمانے جا۔ اگر کچھ جانور ہاتھ آ جائیں اور روٹی مل جائے تو کیوں اس بے چارے کی جان جائے اور ہمارے سر ہتیا جائے۔ نہیں تو اسے کل بادشاہ کے پاس لے جانا۔''

چڑی مار کو اپنی بیوی کی بات پسند نہ آئی۔ وہ بولا ''تو اس کے جھانسے میں آ گئی'' اس کی زبان سے یہ بات سن کر بندر نے کہا کہ ''عجب بات ہے عورت تو ہمدردی کی بات کرتی ہے اور تو مرد ہو کے محنت سے جی چراتا ہے۔ بے محنت کی کھانا چاہتا ہے۔'' یہ بات چڑی مار کے بھی سمجھ میں آ گئی۔ جال پھنکی لے کے روانہ ہوا، اور دن تو دو چار پرندے ہاتھ لگتے تھے، آج جال بھر گیا۔ یہ جانور کئی روپے کے بک گئے، وہ آٹا، دال، نون، تیل، لکڑی لے کے گھر آیا۔ بیوی سے بولا ''ارے یہ مہاراج تو بڑے بھاگوان ہیں، دیکھ بھگوان کی کرپا ہو گئی، سارے دلدر دور ہو گئے۔'' وہ بھی خوش ہو گئی اور بندر کی خوب خاطر کی۔

چڑی مار کے بھاگ تو سچ مچ پھر گئے۔ کپڑا لتا، گہنا پاتا سبھی کچھ جمع ہو گیا۔ ایک بھٹیاری کا گھر چڑی مار کے گھر سے ملا ہوا تھا۔ تھوڑے دنوں بعد اس بھٹیاری کے گھر کوئی تاجر آ کے اترا۔ ایک رات سوداگر نے چڑی مار کے گھر کسی کو بولتا سنا۔ ایسا لگتا تھا کہ کوئی بچہ پیاری پیاری باتیں کر رہا ہے۔ سوداگر نے بھٹیاری سے پوچھا کہ برابر میں کون رہتا ہے اس نے بتایا کہ چڑی مار۔ سوداگر نے کہا کہ اس کا بچہ بڑی پیاری باتیں کرتا ہے۔ بھٹیاری نے بتایا کہ اس کے تو کوئی بچہ نہیں۔ بس میاں بیوی رہتے ہیں۔ سوداگر نے کہا ''آ، سُن!'' اس نے سنا تو

واقعی کسی بچے کے بولنے کی آواز آ رہی تھی۔ سوداگر نے کہا ''اس بچے کی آواز میں بڑا درد ہے، ذرا اسے میرے پاس لے کے آ۔ اس کی باتیں سنوں گا۔ اسے کچھ دوں گا اور تیرا بھی منہ میٹھا کروں گا۔''

بھٹیاری چڑی مار کے گھر پہنچی تو دیکھا کہ بندر باتیں کر رہا ہے مگر اسے دیکھ کے چپ ہو رہا۔ وہ دونوں بھٹیاری کے پیروں پر گر پڑے کہنے لگے۔ ''ہم نے اسے اپنے بیٹے کی طرح پالا ہے۔ ایسا نہ ہو اس کی خبر بادشاہ تک پہنچے اور وہ اسے لے کے مروا دے۔''

وہ بولی ''میں کسی سے کیوں کہنے لگی۔''

وہاں سے لوٹ کے بھٹیاری نے سوداگر سے کہا کہ ''وہاں کوئی نہ تھا۔'' اس نے کہا ''دیوانی پھر وہ آواز کس کی آتی تھی۔'' کہنے لگی ''بلیاں لوں، مجھے کیا غرض جو کہوں کہ بندر بولتا ہے۔'' سوداگر خوب ہنسا، کہنے لگا ''اری سڑن کہیں بندر بولتا ہے۔''

وہ بولی ''صدقے گئی، اسی لیے تو میں بھی نہیں کہتی کہ بندر بولتا ہے۔''

سوداگر کی سمجھ میں نہ آیا کہ کیا قصہ ہے، خود چڑی مار کے گھر چلا گیا۔ جا کے دیکھا کہ واقعی دو میاں بیوی ہیں اور ایک بندر۔ یقین ہو گیا کہ بندر بولتا ہے۔ چڑی مار کی عورت بندر کو چھپانے لگی تو وہ بولا ''اب بھید کھل گیا، یہ بندر مجھے دو، منہ مانگی قیمت لو، نہیں تو

ابھی بادشاہ کو خبر کرتا ہوں۔''

دونوں میاں بیوی یہ سن کر رونے پیٹنے لگے۔ بندر نے سمجھا اب جان نہیں بچتی۔ اتنی ہی زندگی تھی بولا ''بے کار رونے سے کیا فائدہ، ہماری قسمت میں یہی لکھا تھا، تقدیر کے آگے کسی کا بس نہیں چلتا۔ مجھے اس سوداگر کے حوالے کردو۔ بادشاہ کو خبر پہنچی کہ تم نے مجھے چھپا رکھا ہے تو تم سزا پاؤ گے۔''

چڑی مار کو دکھ تو بہت ہوا مگر کر کیا سکتا تھا۔ اس نے سوداگر سے وعدہ لیا کہ اسے بادشاہ کو نہ دینا اور اس کی اچھی طرح دیکھ بھال کرنا۔ پھر وہ بندر سوداگر کے حوالے کردیا سوداگر نے چڑی مار کو بہت سا مال دیا اور بندر کو لے کر سرائے میں آیا۔ اسے خوب سا پیار کیا اور حال پوچھا۔

بندر نے صرف اتنا بتایا کہ ''مصیبت کا مارا ہوں اور کسی طرح اس مصیبت میں گرفتار ہوگیا ہوں۔'' سوداگر کو اس پر بہت ترس آیا۔ اسے بڑی اچھی طرح رکھنے لگا۔ مگر نرالی چیز ہاتھ آئی تھی۔ جو کوئی آتا اسے بندر دکھاتا بلکہ اس کی باتیں سنواتا۔ وہ نکل کے کہیں اور کہتا۔ آخر یہ بات دور دور پہنچی کہ سوداگر کے پاس ایک بندر ہے جو آدمیوں کی طرح بولتا ہے۔

ہوتے ہوتے یہ خبر اس احسان فراموش، نمک حرام وزیرزادے کو پہنچی جو اب شہزادہ بنا بیٹھا تھا۔ سمجھ گیا ہو نہ ہو، یہ وہی بندر ہے۔ اسے فوراً حاصل کر کے موت کے گھاٹ اتار دینا چاہیے۔ فوراً ایک چوب دار کو بھیجا کہ جائے اور بندر لے آئے، مگر سوداگر نے بندر نہ دیا کہ میں نے اسے اولاد کی طرح پالا ہے۔ اس کی جدائی کسی طرح گوارہ نہیں۔ یہ کورا جواب سن کے وزیرزادے کو بڑا تاؤ آیا فوراً وہاں کے بادشاہ غضنفر شاہ کو خط لکھا کہ سوداگر سے بندر ہمیں دلاؤ ورنہ اس شہر کی اینٹ سے اینٹ بجادوں گا۔ اس نے امیروں وزیروں سے صلاح کی۔ سب نے یہی کہا ایک بندر کی خاطر خوان خرابہ اچھا نہیں۔

بادشاہ کے آدمی سوداگر کے پاس پہنچے۔ سوداگر سمجھ گیا کہ اب نہ خوشامد کام دے گی نہ زور زبردستی۔ بندر نے بھی سمجھایا کہ اب ساری تدبیریں بے سود ہیں۔ آخر بہت کہہ سن کے رات بھر کی مہلت ملی۔ یہ طے پایا کہ صبح کے وقت سوداگر خود بندر لے کر شہزادے کی خدمت میں حاضر ہوگا۔

ذرا دیر میں یہ خبر ہر طرف پھیل گئی کہ ایک سوداگر کے پاس بندر ہے جو انسانوں کی طرح بولتا ہے۔ کل صبح یہ بھی مارا جائے گا۔ ہوتے ہوتے یہ خبر مہرنگار تک بھی پہنچی۔ سمجھ گئی ہو نہ ہو یہی شہزادہ ہے۔ وزیرزادے نمک حرام کو بہت کوسا اور لوگوں سے پوچھا کہ ''صبح سوداگر کس راستے سے گزرے گا اور ہم یہ تماشہ کیسے دیکھ سکیں گے۔'' لوگوں نے عرض کیا کہ سوداگر ملکہ کے جھروکے کے نیچے سے گزرے گا۔

یہ سن کر ملکہ ساری رات تڑپتی رہی، نیند نہ آئی۔ دو گھڑی رات سے برآمدے میں آبیٹھی اور ایک طوطا پنجرے میں پاس رکھ لیا۔ دن نکلنے سے پہلے بازار میں ہلڑ ہوا اور تماشائیوں کا میلہ لگ گیا۔

سوداگر نے اٹھ کے صبح کی نماز پڑھی، پھر کمر میں پیش قبض لگا کے ہاتھی پر سوار ہوگیا۔ بندر کو اپنی گود میں بٹھالیا اور مرنے مارنے پر کمر باندھ لی۔ بندر سے بولا ''تو پریشان نہ ہو، پہلے تو اسے سمجھاؤں گا کہ

خواہ مخواہ اس بے گناہ کی جان نہ لے۔ نہ مانا تو پھر بھاری رقم سے کے تیری جان بچانے کی کوشش کروں گا مگر تجھے اس کے حوالے نہ کروں گا۔ مرد جو کہتے ہیں وہی کرتے ہیں۔"

سوداگر کا آگے بڑھنا تھا کہ خلقت نے چاروں طرف سے گھیر لیا۔ بندر لوگوں سے مخاطب ہو کے بولا" صاحبو! یہ دنیا عبرت کی جگہ ہے یہاں کی ہر چیز آنی جانی ہے، قسمت کے آگے ہر ایک لاچار ہے۔ یہاں ایسا کوئی نہیں جسے کوئی نہ کوئی دکھ، کوئی نہ کوئی تکلیف نہ ہو۔ خدا کی قدرت دیکھو کہ مجھ بے زبان کو بولنا سکھایا کہ تم سب میری باتیں سننے چلے آتے ہو، میرے حال پر ترس کھاتے ہو۔ تم سب جانتے ہو کہ آج میرا سامنا ایک ظالم سے ہوگا جو مجھ بے گناہ کے خون سے اپنے ہاتھ رنگے گا۔ جب ظالم ظلم کرتا ہے تو یہ بھول جاتا ہے کہ بادشاہ ہو یا بھکاری سب کا انجام ایک ہے۔ ایک دن سب کو مٹی میں مل کے مٹی ہو جانا ہے۔ کسی کا سنگ مرمر کا مقبرہ بنتا ہے، کسی کو مشکل سے گورگڑھا ملتا ہے، دنیا میں خوشی کے بعد غم ہوتا ہے۔ ہر بلندی کو ایک دن پستی میں بدلنا پڑتا ہے۔ مطلب یہ کہ دنیا کا کارخانہ ایسا ہے جیسے صبح کا چراغ کہ اب بجھا اور جب بجھا۔ اس لیے اس دنیا سے بھلا آدمی دل نہ لگائے۔"

بندر کی تقریر سے لوگ حیران بھی تھے اور اس کی باتوں کا ان پر اثر بھی بہت ہوا تھا۔ ساری خلقت اس کے ساتھ روتی چلی جاتی تھی۔ یہاں تک کہ یہ جلوس ملکہ کے جھروکے کے تلے آپہنچا۔

ملکہ سوداگر سے مخاطب ہو کے بولی "ایک دم کو ٹھہر جا۔ میں بھی اس مصیبت کے مارے کی تقریر سننا چاہتی ہوں" سوداگر نے یہ سن کے ہاتھی روکا۔

ملکہ بندر سے بولی "اے بے زبان مقرر! اے خانماں خراب! ہم اب کس قابل ہیں مگر تجھ پر جو مصیبت پڑی اس کی داستان سننے کی خواہش رکھتے ہیں۔"

بندر نے آواز پہچانی پہلے تو خوب رویا پھر جی ٹھہرا کے کہنے لگا۔

اس کے بعد بندر نے کیا کہا ، اس کا کیا انجام ہوا جان عالم کو اس کا جسم واپس ملا یا نہیں یہ سب اور بہت سے عجیب واقعات پڑھیے اگلی قسط میں!

□ادارہ

والدین سے حُسن سلوک

دنیا کا ہر مذہب اور تہذیب اس بات پر متفق ہے کہ والدین کے ساتھ حُسن سلوک بے حد ضروری ہے اور اولاد کو ان کا ادب واحترام کرنا چاہیے، ان کی ضرورتوں کا خیال رکھنا چاہیے۔ ماں باپ کی خدمت کرنا بڑی سعادت مندی اور خوش نصیبی ہے۔

''حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ ہم نے رسول اللہؐ سے پوچھا کہ ہم میں نیکی کا سب سے زیادہ حقدار کون ہے؟ تو آپؐ نے فرمایا تمہاری ماں۔ پھر ہم نے کہا کہ پھر کون یا رسول اللہؐ۔ آپؐ نے فرمایا تمہاری ماں۔ ہم نے کہا کہ پھر کون یا رسول اللہؐ تو آپؐ نے فرمایا تمہاری ماں۔ تب ہم نے کہا کہ پھر کون یا رسول اللہؐ تو آپؐ نے فرمایا تمہارے باپ پھر جو اُن کے قریب ہوں پھر جو اُن کے قریب ہوں...''

اس حدیث میں یہ بتایا گیا ہے کہ والدین کا درجہ کتنا بلند ہے۔ پہلے ماں کا درجہ پھر باپ کا درجہ۔ والدین کا درجہ اتنا بلند ہے کہ ہم کتنی ہی ان کی خدمت کریں لیکن ہم کبھی بھی ان کے احسان کا بدلہ نہیں چکا سکیں گے کیونکہ ماں کتنی مصیبت اٹھا کر ہماری پرورش کرتی ہے اور باپ کتنی مشقتیں اٹھا کر ہماری ضرورتیں پوری کرتا ہے اور ہمیں اعلیٰ تعلیم دِلاتا ہے۔ اس لیے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ ماں کے قدموں تلے جنت ہے اور باپ جنت کے دروازوں میں سے بیچ کا دروازہ ہے۔

تحریر: آصفہ خانم ایوب خان، مدنی نگر جامنیر، ضلع جلگاؤں، مہاراشٹر ◄

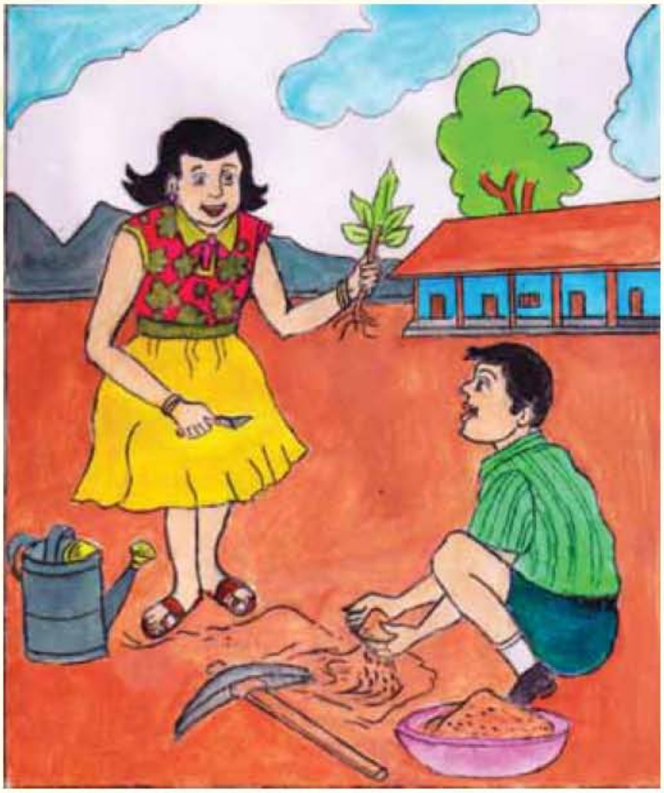

یہ ڈرائنگ ہمیں تنزیلہ طاہر پنجاری نے بھیجی ہے جو ضلع جل گاؤں میں یمبر الہ کے اینگلو اردو ہائی اسکول میں پڑھتی ہیں اور جب انھوں نے یہ ڈرائنگ بنائی ہوگی تب وہ دسویں جماعت میں تھیں۔

ذرا اس طرف بھی توجہ دیں!

'ننھے فنکار' اور 'اردو فیس بک' کے لیے ان دنوں ہمیں لائق اشاعت تصاویر، ڈرائنگز، پینٹنگز، کہانیاں اور دل چسپ چیزیں بہت کم تعداد میں مل رہی ہیں۔ آپ سبھی سے اس طرف توجہ دینے کی درخواست ہے کیونکہ یہ کالم آپ ہی کے ہیں اور آپ ہی کے لیے ہیں۔ **ادارہ**

■ ادارہ

یہ مزے مزے کی حکائتیں...

• سنتا کے پڑوسی کی اسپتال میں موت ہوگئی۔ وہ تعزیت کے لیے اس کے گھر گیا اور پوچھا: "باڈی آگئی کیا؟" تبھی ایمبولنس باڈی لے کر آگئی۔ سنتا بولا: "لو جی بتاؤ۔ کتنی لمبی عمر ہے!"

اجمل، دھولیا

• استاد: "بچو جب قیامت آئے گی تو زمین آسمان ایک ہو جائیں گے۔ چاند سورج ٹکرا جائیں گے۔ سورج بہت قریب آجائے گا۔ سب کچھ پگھلنے لگے گا..."

ایک بچہ: "سر اس دن اسکول کی چھٹی ہوگی کیا؟"

سید عمر فاروق، ناندیڑ مہاراشٹر

• دوستی کا یہ لمبا سفر، تھوڑا تم چلو تھوڑا ہم چلیں اس کے بعد... رکشا کرلیں گے۔

• ٹیچر: ووٹ دینے کی عمر کم سے کم 18 برس ہے، لیکن شادی کی 21 برس۔ ایسا کیوں؟

اسٹوڈنٹ: کیونکہ دیش کو سنبھالنا آسان ہے جب کہ بیوی کو سنبھالنا اتنا آسان نہیں۔

مدثر، منظور پورہ، اورنگ آباد، مہاراشٹر

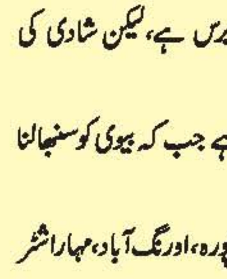

• ٹیچر: دیکھو انور اس مرتبہ تمھیں 100 میں سے 80 نمبر حاصل کرنے ہیں۔

انور: سر آپ کہیں گے تو میں اس مرتبہ 100 میں سے 100 نمبر حاصل کروں گا۔

ٹیچر: تم مذاق کر رہے ہو۔

انور: سر مذاق آپ نے ہی شروع کیا تھا۔

جنید خان، بھراڈی سلود، اورنگ آباد

• سوال: کسی عورت کے لیے سب سے بڑی سزا کیا ہوسکتی ہے؟

جواب: اسے نئے کپڑے دیجیے، اس سے میچ کرتے ہوئے زیورات اور میک اپ کا بہترین سامان بھی دے دیجیے اور تمام آئینے نکال کر کسی کمرے میں بند کر دیجیے۔

رضوان انصاری

• باپ: بیٹے کوئی ایسا کام بتاؤ جس کے لیے لوگ تمھاری تعریف کرتے ہوں!

بیٹا: میرے کلاس فیلو تو اکثر میری تعریف کرتے ہیں۔

باپ: کس کام کے لیے؟

بیٹا: اس لیے کہ میں ٹیچر سے مار کھاتے ہوئے روتا نہیں ہوں!

محمد دانش انور، بلڈانا، مہاراشٹر

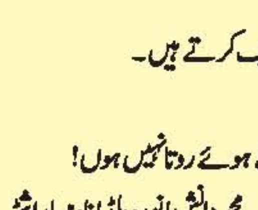

• ٹی وی چینل کی اینکر: جو لوگ اس وقت بور ہو رہے ہیں ان کے لیے ایک دل چسپ سوال۔ بتائیں، دنیا کا پہلا ٹریفک سگنل کس جگہ لگایا گیا تھا! صحیح جواب جانیے اس چھوٹے سے بریک کے بعد۔

بریک: دودھ اور چاکلیٹ کی کمپنی کا اشتہار، کچھ میٹھا ہو جائے۔ ایک ٹی وی چینل کا اشتہار، رشتہ وہی، سوچ نئی۔ موٹر سائیکل کمپنی کا اشتہار، دھک دھک گو۔ شیمپو کا اشتہار: کیٹرینا کی پہلی پسند اور آپ کی؟ ڈٹرجنٹ پاؤڈر کا اشتہار، دادی ایک منٹ! کولڈ ڈرنک کا اشتہار، کیونکہ ڈر کے آگے جیت ہے! اسی طرح کے دو درجن اشتہار دکھانے کے بعد بریک ختم ہوتا ہے اور اینکر واپس آتی ہے۔

ہماری بھی سنیں

کچھ بچوں نے لکھا ہے ایس ایم ایس کے لیے فون نمبر نمایاں طور پر شائع کریں۔ تو بھئی عرض ہے کہ ہم نے ایسا ہی کیا تھا۔ مگر جانتے ہیں کیا ہوا۔ جن صاحب کے پاس وہ فون رہتا تھا۔ چند روز بعد وہ ہاتھ جوڑے دفتر میں آئے اور بولے، ”صاحب آپ نے کس مصیبت میں پھنسا دیا۔ دن رات فون کی گھنٹی بجتی رہتی ہے۔ رات کو دو ڈھائی بجے بھی بچے پوچھتے رہتے ہیں، ہمارا ایس ایم ایس ملا کہ نہیں؟ ایک تو سمجھ میں نہیں آتا رات کو بچے اتنی دیر تک کیوں جاگتے ہیں۔ ان کے والدین انھیں ڈانٹتے کیوں نہیں؟ دوسرے فون نمبر صرف میسج کے لیے دیا گیا تھا۔ بات کرنے کے لیے نہیں۔ کچھ کہنا ہے تو خط لکھیں یا ای میل کریں۔ یا میسج میں ہی لکھ دیں۔ اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ اگرچہ کچھ میسج بڑے ہی فضول اور خراب سے ہیں اس کے باوجود ایسے میسج بڑی تعداد میں مل رہے ہیں جن میں بچوں نے پیاری پیاری باتیں لکھی ہیں۔ اتنے سارے میسج ہم چھاپیں گے کیسے؟“ ان صاحب کی باتیں دل کو لگی تھیں۔ اس لیے ہم نے دوبارہ نمبر نہیں دیا اور طے کیا کہ جب تک موصولہ میسج نسٹ نہیں جاتے تب تک نیا نمبر نہیں چھاپا جائے گا۔ یقین کیجیے ہم ابھی تک فروری 2014 کے میسج بھی پورے نہیں کر پائے ہیں۔ پھر بھی 'بچوں کی دنیا' کے ننھے باشندوں کے لیے ہم ایک نیا نمبر دے رہے ہیں پر آپ اپنے میسج بھیجا کیجیے۔ لیکن کچھ باتوں کا آپ کو خیال رکھنا ہوگا:

1۔ میسج ہفتے میں اتوار کے دن سے جمعہ تک صبح دس سے شام پانچ بجے کے درمیان بھیجے جائیں۔ ان اوقات کے علاوہ بھیجے گئے میسج اپنے آپ Delete ہو جائیں گے۔ اور ہاں سرکاری چھٹیوں میں بھی میسج نہ بھیجیں۔ 2۔ بہت سارے میسج بھیجنے کی بجائے ایک یا دو بہت اچھے میسج بھیجا کریں۔ 3۔ اپنا اور شہر کا نام ضرور لکھیں۔ فون نمبر ہم کسی کا شائع نہیں کریں گے۔ 4۔ چاہیں تو اپنی تصویر بھی موبائل پر بھیج سکتے ہیں مگر وہ صاف اور چھپنے کے لائق ہونی چاہیے۔ 5۔ اردو میں ٹائپ کیے گئے میسج کو ترجیح دی جائے گی۔ اس کے لیے قومی اردو کونسل کی ویب سائٹ سے اپنے موبائل پر اردو فونٹ ڈاؤن لوڈ کریں۔ 6۔ پرانے نمبر پر ہرگز کچھ نہ بھیجیں۔ اور اب نیا نمبر نوٹ کریں: 9540165653 لیکن اس پر کال ہرگز نہ کریں، آپ کی کسی بات کا جواب نہیں دیا جائے گا۔ یہ نمبر صرف میسج بھیجنے کے لیے ہے۔ برا نہ مانیں۔ اعزازی مدیر

انکر: ویلکم بیک۔ تھینکس فار دی ویٹ۔ دنیا کا پہلا ٹریفک سگنل سڑک پر لگایا گیا تھا۔

محمد سلیم، ملکاپور مہاراشٹر

• زندگی کا حساب: دوستوں کو جمع کرو۔ غم کو تقسیم کرو۔ خوشیوں کو ضرب دو۔ اور زندگی کا لطف لو۔

عرفات ترنم

• ”امی، میں دریا میں کیوں نہیں نہا سکتا؟“

”بیٹا اس کا پانی بہت گہرا ہے۔“

”لیکن ابو بھی تو اسی دریا میں نہاتے ہیں۔“

”ابو کی بات اور ہے۔ ان کا بیمہ ہو چکا ہے۔“

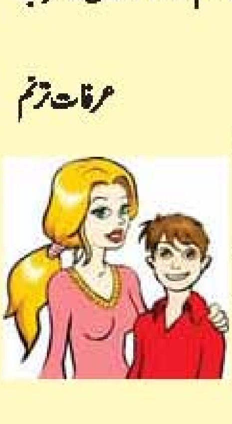

• دنیا کا سب سے امیر شخص بل گیٹس ہے۔

دنیا کا سب سے امیر ملک کویت ہے۔

دریائے نیل کا پانی گرم ہوتا ہے۔

دنیا میں کل 212 ملک ہیں۔

دنیا کا سب سے غریب ملک بھوٹان ہے۔

سعودی عرب میں ایک بھی ندی نہیں۔

دنیا کا سب سے بڑا ائرپورٹ جدہ (سعودی عرب) میں ہے۔

دنیا کی سب سے قدیم زبان سنسکرت ہے۔

• سنتا: افسوس، میری چائنا کی بیوی مر گئی یار۔

بنتا: افسوس نہ کر یار، یہ چائنا کی ہر چیز ایسی ہی ہوتی ہے۔

نام نہیں لکھا

• ایک پاگل زور زور سے چلا رہا تھا، ”میں اس دنیا کو مٹا دوں گا، مٹا دوں

گا، بالکل مٹا کر رکھ دوں گا۔"
اس پر دوسرے پاگل نے کہا: "بے وقوف تو اپنے آپ کو کیا سمجھتا ہے۔ میں تجھے ربڑ ہی نہیں دوں گا۔"

دانش شیخ امین، اڈواڈ

• امتحان کے ہال میں ایک لڑکے کو پریشان دیکھ کر ٹیچر نے کہا: "کیا بات ہے؟ پیپر بہت مشکل ہے کیا؟"

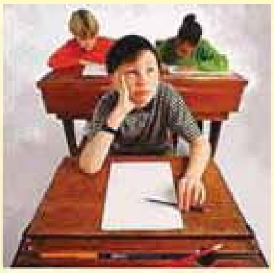

لڑکے نے کہا: "جی نہیں۔"
"تو اتنے پریشان کیوں ہو؟" ٹیچر نے پوچھا۔
لڑکا بولا: "جناب سوچ رہا ہوں کی تیسرے اور چوتھے سوال کا جواب میری کس جیب میں ہے؟"

محمد خسرو، ناندیڑ

• ٹیچر کے نام چھٹی کی ایک درخواست:

مودبانہ گزارش ہے
نہ دھوپ ہے نہ بارش ہے
آپ کا شاگرد بیمار ہے
اسے چھٹی درکار ہے
باپ دوکاندار ہے
بخار ایک سو چار ہے
یہی میری عرضی ہے
آگے آپ کی مرضی ہے

محمد اظہر، بھساول

• زندگی سے بور ہو گئے ہو، بالکل تنگ آ گئے ہو تو ایک لمبی سی رسی لو، گھر سے باہر نکل کر کسی مضبوط پیڑ کے پاس جاؤ، پیڑ کی ڈال پر رسی باندھ کر اس کا پھندا بناؤ...
...اور اس میں بیٹھ کر خوب جھولا جھولو۔ انجوائے کرو یار!

• بجلی + بادل = ساون آیا
بارات + باجا = دولہا آیا
پھول + نظارے = بسنت آیا
آپ + آپ کی ہنسی = بھاگو بھاگو بھوت آیا!

خدیجہ باگوان، لاتور

• میری خوشی پر کس کا پہرا ہے
جانے کس امید پہ دل ٹھہرا ہے
جسے پکار رہے تھے برسوں سے
آج پتہ چلا وہ بہرا ہے

مہک خان، ناگپور

• سنا ہے آپ کی ایک مسکراہٹ پر ہر کوئی مرتا ہے
ذرا ٹائم نکال کر ہمارے یہاں آ جائیے
ایک چوہا مروانا ہے
بہت دنوں سے پریشان کر رکھا ہے!

فرزانہ خان ناگپور

• دوستی بارش نہیں کہ برسے اور تھم جائے
دوستی سورج نہیں کہ چمکے اور ڈوب جائے
دوستی پھول نہیں کہ کھلے اور مرجھا جائے
دوستی نام ہے سانس کا
جو چلے تو زندگی اور رکے تو موت بن جائے

رضوانہ خان ناگپور

• آنسو تیرے نکلیں تو آنکھیں میری ہوں
دل تیرا دھڑکے تو دھڑکن میری
سڑک پر لوگ تجھے پیٹیں اور غلطی میری ہو

سید تنویر، ناندیڑ

ادارہ

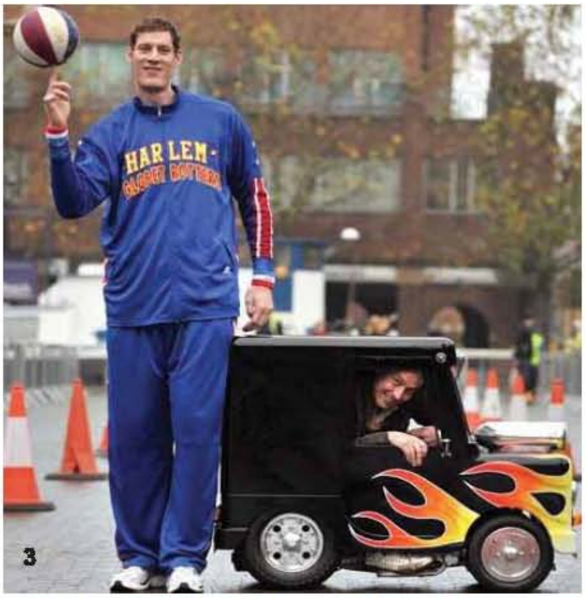

1 اس شمارے کی تصویر 2 مرغ اور سانپ، ایک نادر فوٹو 3 دنیا کا طویل ترین برطانوی باسکٹ بال پلیئر پال ٹنی اسٹرگیس سب سے چھوٹی کار کے ساتھ 4 یہ ہیں اورنگوٹان جو ملیشیا اور انڈونیشیا میں پائے جاتے ہیں اور سائنسداں انھیں انسان کا دور کے رشتہ دار بتاتے ہیں 5 یہ کہیں اکیسویں صدی کے گلیور تو نہیں 6 بارش ہو یا سیلاب، زندگی ایسے ہی چلتی رہتی ہے

Back Inner Cover

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی چند مطبوعات

کلیات ملا رموزی (جلد اوّل حصہ اوّل)

مرتب: خالد محمود
صفحات: 453
قیمت: -/151 روپے

کلیات ملا رموزی (جلد اوّل حصہ دوم)

مرتب: خالد محمود
صفحات: 454 تا 896
قیمت: -/140 روپے

کلیات ملا رموزی (جلد دوم)

مرتب: خالد محمود
صفحات: 750
قیمت: -/243 روپے

کلیات ملا رموزی (جلد سوم)

مرتب: خالد محمود
صفحات: 710
قیمت: 235 روپے

کلیات ملا رموزی (جلد چہارم)

مرتب: خالد محمود
صفحات: 875
قیمت: 279 روپے

کلیات ملا رموزی (جلد پنجم)

مرتب: خالد محمود
صفحات: 428
قیمت: -/156 روپے

مقالاتِ مسعود

مصنف: مسعود حسین خان
صفحات: 230
قیمت: -/106 روپے

علامہ فضل حق خیرآبادی: چند عنوانات

مصنف: خوشتر نورانی
صفحات: 248
قیمت: -/91 روپے

تحقیق و تعارف

مصنف: حنیف نقوی
صفحات: 288
قیمت: -/99 روپے

پیروڈی: نقد و انتخاب (جلد اوّل)

مرتبہ: امتیاز وحید
صفحات: 354
قیمت: 118 روپے

پیروڈی: نقد و انتخاب (جلد دوم)

مرتبہ: امتیاز وحید
صفحات: 368
قیمت: 133 روپے

ہندوستانی تہذیب

مصنف: ابن کنول
صفحات: 399
قیمت: -/131 روپے

تعلیمی رہنمائی اور صلاح کاری

مصنف: عبدالغنی مدہوش
صفحات: 192
قیمت: -/67 روپے

جدید دنیا میں تعلیم

مصنف: نیاز احمد اعظمی
صفحات: 179
قیمت: -/73 روپے

تعلیمی نفسیات

مصنف: طلعت عزیز
صفحات: 242
قیمت: -/96 روپے

پودھ حفاظتی آلات کی مرمت اور دیکھ بھال

مترجم: سید ظفر الاسلام
صفحات: 78
قیمت: -/64 روپے

پیٹ کے کیڑے

مصنف: محمد رفیق اے ایس
صفحات: 79
قیمت: -/40 روپے

حسن نعیم اور نئی غزل

مصنف: احمد کفیل
صفحات: 284
قیمت: -/104 روپے

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، ونگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی- 110066
فون: 011-26109746 فیکس: 011-26108159 sales@ncpul.in ,E-mall.:ncpulsaleunlt@gmall.com

Front Inner Cover

قومی اردو کونسل کی فخریہ پیش کش

ماہنامہ اردو دنیا

دہلی
Monthly URDU DUNIYA, New Delhi

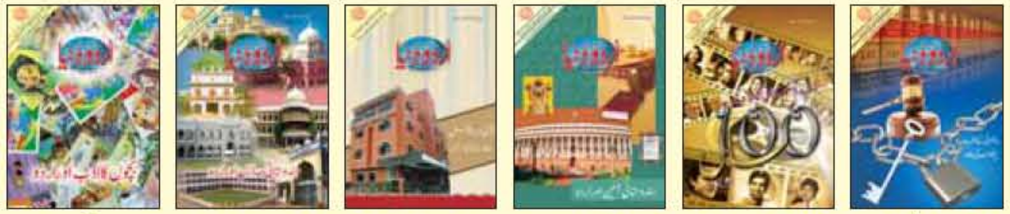

تمام تر رنگین صفحات اور دیدہ زیب تصاویر سے مزین ماہانہ عالمی جریدہ جسے آپ پوری دنیا میں اردو زبان کے کسی بھی ماہنامے سے بہتر پائیں گے۔ اردو کو آج کی دنیا سے جوڑنے والا اور عام اردو قاری و ادبی حلقوں کی دلچسپی کے ساتھ طلبا و اساتذہ کی ضرورتوں کا بھی خیال رکھنے والا اردو کا ماہنامہ

ہر شمارے میں پڑھیئے، اردو کے ادبی شاہکاروں کے علاوہ، علمی مضامین، ادبی انٹرویو، تاریخ، سائنس، صحافت، نئی کتابوں پر تبصرے، قومی اردو کونسل کی سرگرمیوں، سیمیناروں اور فروغ اردو سے متعلق نئی کاوشوں کا احوال اور بہت کچھ!

فی شمارہ: 15 روپے، سالانہ: 150 روپے

اردو زبان میں علم و آگہی کا معتبر ادبی جریدہ

سہ ماہی فکر و تحقیق

قومی اردو کونسل کی منفرد پیشکش

اردو زبان و ادب سے متعلق اہم تنقیدی و تحقیقی موضوعات پر فکر انگیز اور تلاش و جستجو کو صحیح سمت دینے والے مواد کے ساتھ ہر تین ماہ بعد منظرِ عام پر آنے والا نہایت سنجیدہ علمی مجلّہ خود بھی پڑھیں اور دوسروں کو بھی پڑھنے کا مشورہ دیں!

ہندستانی خریداروں کے لیے سالانہ قیمت: 100 روپے، فی شمارہ: 25 روپے

(قومی اردو کونسل کی ویب سائٹ http://www.urducouncil.nic.in پر بھی دستیاب)

آج ہی اپنے نزدیکی بک اسٹال سے طلب کیجیے یا ہمیں لکھئے

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، ونگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی 110066، فون: 26109746، فیکس: 26108159
E-mail.:ncpulsaleunit@gmail.com , sales@ncpul.in